معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

نوٹ: (ہندوستانی روپے کے حساب سے رقم قبول کی جائے گی۔)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست ششماہی

ماہ جولائی ۲۰۰۷ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۷ء

۱۸۰ویں جلد

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست ششماہی

ماہ جولائی ۲۰۰۷ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۷ء

۱۸۰ویں جلد

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
	کلیات پریم چند			آثار علمیہ و تاریخیہ	
۲۳	مولانا روم مولانا شبلی کی نظر میں	۲۴۵،۳۲۵		ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نام اہل علم کے خطوط	۴۷۲
۲۴	مولانا عبدالماجد بدایونی	۲۸۸		**ادبیات**	
۲۵	نسخ: مفہوم اقسام ذرائع علم	۱۰۵		غزل	۳۹۳
	اخبار علمیہ	۵۷،۱۴۹، ۲۳۴،۳۰۶، ۳۸۴،۴۶۶		**مطبوعات جدیدہ**	۷۲،۱۵۳، ۲۳۵،۳۱۸، ۳۹۴،۴۷۵
	معارف کی ڈاک				
۱	جامع معمر یا جامع عبدالرزاق	۶۸			
۲	دار المصنفین کی دو نئی کتابیں	۶۰			
۳	لداخی مسافر اور ہندوستان کے تعلیمی مراکز	۶۲			
۴	مسلمانوں کی تعلیم	۱۵۲			
۵	معراج میں پانچ نمازیں	۴۶۹			
	وفیات				
۱	پروفیسر گیان چند جین	۳۱۳			
۲	جناب قرۃ العین حیدر	۳۱۴			
۳	ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی	۳۱۶			
۴	رام چندر گاندھی	۳۱۷			
۵	شیخ نذیر حسین	۳۸۷			
۶	مولانا عبدالکریم پاریکھ	۳۱۱			
۷	مولانا مختار احمد ندوی	۳۰۹			

جلد ۱۸۰ ماہ جمادی الآخر ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۰۷ء عدد ۱

فہرست مضامین

ای میل : email : shibli_academy@rediffmail.com

ویب سائٹ : www.shibliacademy.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

دو قوموں، دو ملتوں اور دو مذہبوں میں تو اختلافات ہوتے ہی ہیں لیکن ایک ہی قوم، ایک ہی ملت اور ایک ہی مذہب والوں کے درمیان بھی اختلافات ہوتے ہیں، اول الذکر قسم کے لوگوں میں ایک قوم و مذہب والے دوسری قوم و مذہب والوں کو زیر کرنے کی تاک میں رہتے ہیں اور موقع پاتے ہی ایک قوم دوسری قوم پر حاوی اور غالب ہو جاتی ہے لیکن جب ایک ہی قوم و ملت اور مذہب کے گروہوں میں اختلاف ہوتا ہے تو گو وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کو پسپا اور مغلوب کرنے کے لئے فکر مند رہتے ہیں، تاہم جب ان پر کسی دوسری قوم و ملت اور مذہب کے لوگ حملہ آور ہوتے ہیں تو اس کے سارے متخالف گروہ مل کر حملہ آوروں کو مغلوب کرنے میں جٹ جاتے ہیں، کس مذہب میں متعدد فرقے اور گروہ نہیں ہیں؟ لیکن ان کے گروہی اختلافات دشمنوں کے مقابلے میں مانع نہیں ہوتے، مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے لیکن اب بدقسمتی سے مسلمان ان دشمنوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو انہیں نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں اور وہ ان سے صف آرا ہونے کے بجائے آپس ہی میں دست و گریباں رہتے ہیں، اس وقت امریکہ اور اسرائیل کی گھناؤنی سازش اور مغرب کی پرفریب ڈپلومیسی اور عیارانہ سیاست نے فلسطین میں حماس اور الفتح کو لڑا کر فلسطینی ریاست کے قیام کے امکان کو بعید تر کر دیا، افغانستان اور عراق میں بھی ان کا یہی کھیل جاری ہے، ہندوستان میں فرقہ پرست مسلمانوں کے اختلافات کو ہوا دے کر اپنا مقصد برآری میں لگے ہوئے ہیں۔

صیاد مژدہ باد عنادل میں چل گئی　　اب کشمکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے

جب مردوں ہی کی طرح دین اسلام کے احکام و ہدایات کی مکلف عورتیں بھی بنائی گئی ہیں تو مردوں ہی کی طرح ان کے لئے بھی دین کی واقفیت اور علم دین کی تحصیل ضروری ہے لیکن ہندوستان میں عورتوں کو ہمیشہ بے وقعت اور مردوں سے کم تر سمجھا جاتا رہا ہے، اس لئے ان کی تعلیم اور اصلاح و تربیت سے غفلت برتی گئی، اس کے اثرات یہاں کے مسلمانوں پر بھی پڑے اور ان کی عورتیں بھی تعلیم و تہذیب سے محروم رہیں لیکن اب حالات تبدیل ہوئے ہیں اور بچوں کی

طرح بچیوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام بھی ہو رہا ہے بلکہ ان کی اقامتی درس گاہیں بھی قائم کی جانے لگی ہیں لیکن بچیوں کے اقامتی مدرسوں یا ان کی مخلوط تعلیم کی قباحتیں اور خرابیاں وقتاً فوقتاً سامنے آرہی ہیں، ان سے لوگوں کو چوکنا رہنا بہت ضروری ہے، چند ماہ پہلے جامعۃ الصالحات الہ آباد کی طالبات کی جو رسوائی اور بے عزتی ہوئی اس کا کوئی مداوا اب تک نہیں ہوا، جامعہ کے منتظمین کی کوتاہی اور غفلت یہ تھی کہ انہوں نے شہر سے دور ویرانے میں مدرسہ قائم کیا جس کی نہ عمارت مستحکم، نہ دروازے مضبوط اور نہ دربان تندرست و توانا، اسی لئے شرپسند اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہوئے، ہمارا مقصد اقامتی مدرسوں کی مخالفت نہیں بلکہ ان کے ذمہ داروں کو محتاط اور چوکنا کرنا ہے کیوں کہ وہ امانت میں خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

پہلے حج کا سفر کتنا زحمت طلب اور پر مشقت ہوتا تھا، اس کا تصور بھی اب نہیں کیا جاسکتا، سعودی حکومت کے قیام کے بعد راستے پرامن اور سفر حج میں آسانیاں ہونے لگیں جن میں سال بہ سال برابر اضافہ ہو رہا ہے، ۱۹۷۳ء میں راقم کے والدین حج بیت اللہ کو گئے تھے تو میں انہیں بمبئی تک چھوڑنے گیا تھا، کیوں کہ اس وقت عازمین حج وہیں سے سمندری جہاز پر سوار ہوتے تھے اور آج کل کے مقابلے میں خاصی زحمتیں ہوتی تھیں جن کا احساس ہمارے بعض عزیزوں اور احباب کی وجہ سے ہمیں نہیں ہوا، ۱۹۹۲ء میں مجھ کو جب یہ سعادت میسر آئی تو بمبئی کے بجائے دہلی سے ہوائی جہاز روانہ ہوا اور ۱۹۷۳ء سے کہیں زیادہ آسانیاں نظر آئیں، ادھر چند برسوں سے اعظم گڈھ وغیرہ کے لوگوں کو ہوائی جہاز لکھنؤ ہی سے لے جارہا تھا کہ اب اس سال یہ خوش آیند خبر آئی ہے کہ ۲۰۰۷ء میں اتر پردیش کے مشرقی اضلاع کے عازمین حج بنارس کے ہوائی اڈے سے جدہ کے لئے روانہ ہوں گے، اس کے لئے ہم یو، پی، اے کی چیئر پرسن مسز سونیا گاندھی اور وزیر اعظم مسٹر منموہن سنگھ کے تو شکر گزار ہیں ہی لیکن اپنے علاقے کے خادم الحجاج اور مرکزی حج کمیٹی کے سرگرم رکن حافظ نوشاد اعظمی کے خاص طور پر تہہ دل سے ممنون ہیں کیوں کہ یہ سہولت ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

حال ہی میں ڈاکٹر علی جاوید کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے، ہم انہیں مبارک باد دیتے ہیں، وہ ایک فعال اور متحرک شخص ہیں ان سے ہم کو بجا طور پر

امید ہے کہ وہ اردو کی ترقی وفروغ کے لئے پوری جد وجہد کریں گے اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ بھی کریں گے، اردو کی موجودہ انجمنوں اور تحریکوں کی بے عملی اور تعطل اور اردو والوں کی غفلت اور بے پروائی سے ملک میں اس کا جو بدتر حال ہوا ہے، اس کے متعلق انہوں نے بالکل صحیح فرمایا کہ ''اردو زبان وادب کے تحفظ، بقا اور ترویج واشاعت کے لئے خود اردو والوں کو بیدار ہونے کی ضرورت ہے'' ان کا تعلق شمالی ہند اور خاص اتر پردیش سے ہے، اس لئے یہاں اردو کی ناگفتہ بہ حالت ان کے لئے زیادہ سوہان روح ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس صورت حال میں تبدیلی آئے اور اردو والے اس سلسلہ میں اپنا محاسبہ کریں، ان کے خیال میں اتر پردیش، بہار، دہلی اور کئی ریاستوں میں اردو کے تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں ایک مشن اور تحریک کے طور پر کام کرنا پڑے گا، اس منصب پر ڈاکٹر صاحب کا تقرر اردو کے لئے ایک نیک فال ہے، کاش وہ اردو کی غیر موثر اور بے جان تحریکوں میں نئی روح پھونک دیں۔

۵/اگست ۲۰۰۵ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدر آباد کا پہلا کانوکیشن ہوا تھا اور اب دوسرا کانوکیشن ۱۶/جون ۲۰۰۷ء کو ہوا، ان کے دعوت نامے گو خاکسار کو بھی ملے تھے مگر وہ محروم سعادت رہا، دوسرے کانوکیشن کا خطبہ مہمان خصوصی مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے دیا، جنہیں اس موقع پر ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی تفویض کی گئی، یونی ورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی کورسز سے فارغ التحصیل طلبا کو اسناد عطا کیے جانے کے علاوہ ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو کے نائب صدر جناب شمس الرحمان فاروقی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں بھی پیش کی گئیں جس کے یہ دونوں حضرات واقعی مستحق تھے، ہم ان حضرات کو اپنی اور دارالمصنفین کی جانب سے مبارک باد دیتے ہیں، یونی ورسٹی کے انچارج پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ ڈاکٹر شجاعت علی راشد کے تازہ مکتوب سے معلوم ہوا کہ تعلیمی سال ۰۸-۲۰۰۷ء کے لئے کیمپس ایجوکیشن کے تحت ایم ایڈ، بی ایڈ اور ڈی ایڈ کے علاوہ دس پوسٹ گریجویشن کورسز جن میں تین نئے کورسز بھی شامل ہیں، داخلوں کا اعلان کیا گیا ہے، مزید تفصیلات یونی ورسٹی کے ویب سائٹ www.manuu.ac.in یا فون نمبرس 23006612-15 سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

مقالات

جغرافیہ کے اسلامی تصورات

قرآن، حدیث اور علم شکل ارض کی روشنی

از:- جناب مولانا انیس الرحمن ندوی☆

کرۂ ارض پر خشکی اور سمندر کا تناسب کتنا ہے؟ اس کے متعلق زمانہ قدیم (ماقبل اسلام) کے جغرافیائی لٹریچر میں کوئی واضح تصور نہیں ملتا، زمین کے متعلق اہل یونان میں مقبول ترین نظریہ یہ رہا کہ زمین گول نہیں بلکہ چپٹی ہے، لہذا یوروپ میں پندرہویں صدی کے اختتام تک یہی نظریہ رائج رہا، پانچویں صدی عیسوی کے ہندوستانی ماہر فلکیات آریہ بھٹ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین گول ہے اور اس کے تخمینہ کے مطابق کرۂ ارض پر سمندر اور زمین کا تناسب نصف نصف ہے (۱) مگر یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ کرۂ ارض کو چوں کہ اس دور میں نہ مکمل طور پر دریافت کیا گیا تھا اور نہ اس کے جغرافیائی خصوصیات کی مکمل نوعیت جانی گئی تھی، اس لئے اس سلسلے کے تمام بیانات ظن وتخمین اور خیال آرائی کے دائرے میں آتے ہیں۔

کرۂ ارض پر خشکی اور سمندر کا تناسب: اس سلسلے میں بعض احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں کرۂ ارض اور اس کے جغرافیا کے متعلق انتہائی دقیق معلومات موجود ہیں، ان احادیث کا مفہوم بہ ظاہر جغرافیا کے حقائق سے متصادم نظر آتا ہے مگر علم جغرافیا اور اس سے متعلقہ علوم کے جدید اکتشافات کے تطبیقی مطالعہ سے ان احادیث کی صداقت نہ صرف حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتی ہے بلکہ اس سے کرۂ ارض کی جیولوجیائی تاریخ کے کئی اہم ترین پہلو بھی سامنے آتے ہیں، ان احادیث میں سے ایک حدیث جس کی تخریج حضرت ابوالشیخ بن حیان (م ۳۶۹ھ) نے کی

☆ رفیق فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور ۲۹۔

ہے اس طرح ہے:

أخرج أبو الشيخ عن حسان بن عطيه قال بلغني أن مسيرة الأرض خمس مائة سنة بحورها منها ثلاث مائة سنة و الخراب منها مسيرة مائة سنة و العمران مسيرة مائة سنة ۔(۲)

''ابوالشیخ حضرت حسان بن عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ زمین کی کل مسافت پانچ سو سال کی ہے، جس میں سمندروں کی مسافت تین سو سال ہے، خراب (غیر آباد) حصہ کی مسافت سو سال ہے جب کہ آباد منطقہ کی مسافت سو سال کی ہے''۔

اسی معنی کی ایک اور روایت حسب ذیل ہے:

أخرج ابن المنذر و ابن أبی حاتم عن حسان بن عطية رضي الله عنه قال سعة الأرض مسيرة خمس مائة سنة، البحار ثلاث مائة و مائة خراب و مائة عمران ۔(۳)

''ابن منذر اور ابن ابی حاتم حسان بن عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: زمین کی وسعت پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے، سمندر کی مسافت تین سو سال، خراب کی سو سال اور آباد کی سو سال ہے''۔

اس سے ذرا مختلف کی ایک حدیث کی تخریج ابن ابی حاتم نے کی ہے:

أخرج ابن أبی حاتم عن عبد الله بن عمرو قال: الدنيا مسيرة خمس مائة عام، أربع مائة خراب و مائة عمران ۔(۴)

''ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: زمین کی مسافت پانچ سو سال ہے، ان میں سے چار سو سال کی مسافت خراب اور ایک سو سال کی مسافت آباد ہے''۔

جیسا کہ ان احادیث کے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان میں ''مسافت'' کا لفظ تناسب بتانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، لہذا پہلی دو احادیث میں بتایا جارہا ہے کہ کرۂ ارض پر سمندروں کا تناسب اس کے کل رقبے کا ۵/۳ حصہ ہے جب کہ اس کا بقیہ ۵/۲ حصہ خشکی پر مشتمل ہے اور خشکی کے اس حصے میں سے نصف یعنی ۵/۱ خراب (غیر آباد) ہے اور بقیہ نصف ۵/۱ حصہ

آباد (عمران) ہے، اسی طرح تیسری حدیث میں بتایا جارہا ہے کہ کرۂ ارض کا خراب حصہ ۵/۴ ہے جبکہ آباد حصہ ۵/۱ ہے۔

آیئے اب جدید جغرافیائی تصورات وتحقیقات کی روشنی میں ان احادیث کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس سلسلے میں پہلے پہلی حدیث پر بحث کی جائے گی، لہذا جدید تحقیقات کے مطابق کرۂ ارض پر سمندروں کا تناسب ۷۰٫۸ فیصد ہے جب کہ خشکی کا تناسب ۲۹٫۲ فیصد ہے، یعنی کہ ان کی رو سے کرۂ ارض پر تقریباً سات حصہ پانی ہے جب کہ تین حصہ خشکی ہے۔

یہاں حدیث شریف اور علم جغرافیا کی جدید تحقیقات میں بہ ظاہر تضاد نظر آرہا ہے یعنی کہ احادیث میں پانی اور خشکی کا تناسب ۳:۲ بتایا گیا جب کہ علم جغرافیا کے مطابق ان کا تناسب ۷:۳ ہے مگر اس سلسلے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں مفاہیم اپنی اپنی جگہ درست ہیں، کیوں کہ جغرافیائی اعداد وشمار خشکی اور پانی کے موجودہ تناسب کو بتارہے ہیں جب کہ حدیث میں خشکی اور پانی کے حقیقی حدود کی نشان دہی کی جارہی ہے، اس بحث کو سمجھنے کے لئے بحریات oceanography کے بعض مباحث کو مد نظر رکھنا ضروری ہوگا جو حسب ذیل ہیں:

براعظمی حاشیہ Continental Margins: جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق خشکی اور سمندر کا موجودہ تناسب سمندر اور خشکی کے حقیقی حدود کی نشان دہی نہیں کرتا، کیوں کہ آج خشکی کا بڑا حصہ سمندر میں ڈوبا ہوا ہے جس کے کئی اسباب و وجوہ ہیں، ان پر بحث اس مضمون میں آگے ملاحظہ ہو، سمندروں میں خشکی کے اس ڈوبے ہوئے حصہ کو براعظمی حاشیہ کہا جاتا ہے، اس براعظمی حاشیہ کو سائنس داں تین حصوں میں بانٹتے ہیں:

۱-براعظمی فرش/تہہ continental shelf ۔ ۲-براعظمی ڈھلان continental slope ۔ ۳-براعظمی ابھار continental rise ۔

براعظمی فرش: براعظمی فرش دراصل موجودہ براعظمی فرش کے حدود اصلی کی نشان دہی کرتے ہیں یعنی کہ براعظموں کا وہ حصہ جو سمندروں میں غرقاب ہو چکا ہے، اس حصہ کے اختتام پر براعظمی زمین میں کھائی کی طرح ڈھلان شروع ہو جاتا ہے، یہ موجودہ سمندری ساحل سے اوسطاً ۵۰ تا ۱۰۰ کلومیٹر (۳۰ تا ۶۰ میل) چوڑا ہوتا ہے، کہیں کہیں اس کی چوڑائی ۱۵۰۰

کلو میٹر بھی ہے، ساحل سمندر سے اس کے باہری کنارے outer edge تک اس کی گہرائی بالعموم ۱۳۰ میٹر (۴۲۵ فیٹ) ہے، براعظمی فرش سمندری فرش sea floor کے کل رقبے کے ۷،۵ فیصدی حصہ کو گھیرے ہوئے ہے (۵) یعنی کہ موجودہ کل سمندری حصہ (۷۰،۸) کا ۷،۵ حصہ براعظمی فرش پر مشتمل ہے، ملاحظہ ہو شکل نمبر ایک اور شکل نمبر ۲۔

براعظمی ڈھلان: براعظمی فرش کا نقطہ اختتام جسے shelf break بھی کہا جاتا ہے، وہاں سے سمندری فرش میں دفعتاً اضافہ شروع ہو جاتا ہے، یہاں ڈھلان کا انحناء براعظمی فرش کے ڈھلان کی بہ نسبت فی میٹر دس گنا زیادہ ہے، براعظمی حاشیہ کے اس حصہ کو براعظمی ڈھلان کہا جاتا ہے، گویا کہ یہ براعظمی دیواریں ہیں جو براعظمی فرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، براعظمی ڈھلان سمندری فرش کے کل رقبے کے ۸،۵ فیصدی حصے کو گھیرے ہوئے ہے۔ (۶)

براعظمی ابھار: براعظمی حاشیہ کا تیسرا حصہ براعظمی ابھار ہے جو سمندر اور براعظموں کے درمیان کی آخری کڑی ہے، یہ سمندری فرش کے کل رقبہ کے ۳ فیصدی حصے کو گھیرے ہوئے ہے مگر یہ براعظمی فرش اور براعظمی ڈھلان سے اس معنی میں مختلف ہے کہ براعظمی فرش اور براعظمی ڈھلان دونوں براعظمی قشر ارض continental crest پر واقع ہیں جب کہ براعظمی ابھار کا بیشتر حصہ سمندری قشر ارض oceanic crest پر واقع ہے یعنی کہ براعظمی ابھار کا زیادہ تر حصہ سمندری فرش کے اوپر سے شروع ہوتا ہے، لہذا براعظمی ابھار دراصل سمندری حصہ شمار کیا جاتا ہے، یہ دراصل زمینی ترسیبات sediments کی شکل میں ہے جو بُردگی erosion کے عمل کے بعد سمندری سطح پر آکر ڈھیر ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو شکل نمبر-۱۔

شکل ۱ براعظمی حاشیہ continental margins: سمندر اور براعظم کے حقیقی حدود

چوں کہ براعظمی تختی اور براعظمی ڈھلان ہی براعظمی حصہ شمار کیا جاتا ہے اور ان دونوں کا تناسب سمندری فرش کے کل رقبہ کا ۱۶ فیصد ہوتا ہے یعنی (16 = 7.5+8.5)، لہذا یہ رقبہ کرۂ ارض کے کل رقبہ کا ۱۱،۳ فیصد ہوتا ہے جس کا حسابی فارمولا حسب ذیل ہے:

$$(70.8 \times 16) / 100 = 11.32$$

اب کرۂ ارض کی موجودہ خشکی کے تناسب میں اس تناسب کو جوڑ دینے سے اس کی شکل یہ بنتی ہے:

$$29.2 + 11.3 = 40.5$$

یعنی کہ کرۂ ارض پر خشکی کا کل رقبہ 40.5 فیصد ہے جس میں 29.2 فیصد حصہ سطح سمندر کے اوپر ہے اور 11.3 فیصد حصہ زیر آب ہے، لہذا اب خشکی کے زیر آب حصہ کے تناسب کو سمندری حصہ کے تناسب سے گھٹا دیا جائے (کیوں کہ سمندر کے موجودہ حصہ میں خشکی کا یہ ڈوبا ہوا حصہ بھی شامل ہے) تو سمندری بیسن ocean basin کے حصہ کا حقیقی تناسب یہ بنتا ہے:

$$70.8 - 11.3 = 59.5$$

اس طرح کرۂ ارض پر اب خشکی کے حصہ کا حقیقی رقبہ اس کے کل رقبے کا ۴۰،۵ فیصد ہوا جس کا تناسب تقریباً ۲/۵ ہوتا ہے اور سمندری حصہ کا رقبہ اس کے کل رقبہ کا ۵۹،۵ فیصد ہوا جس کا تناسب تقریباً ۳/۵ ہوتا ہے، لہذا یہ تناسب حدیث شریف میں مذکور خشکی اور سمندری کے تناسب ۲:۳ کے بالکل عین مطابق ہوا، اس کی مزید تفصیلات لفظ "عمران" اور "خراب" کے تحت آگے ملاحظہ ہو۔

خشکی کے حقیقی حدود اور سمندر میں اتار چڑھاؤ کے اسباب: کرہ ارض کے ماضی میں جب سطح سمندر اس کی موجودہ سطح سے نیچے تھی، اس وقت براعظمی فرش کا بڑا حصہ جو اب زیر آب ہے، سطح سمندر کے اوپر نمودار تھا، سطح سمندر میں اس تفاوت کی ایک اہم وجہ براعظمی برفانیت continental glaciation ہے، یعنی کہ ماضی میں جب کرۂ ارض کا درجہ حرارت کم تھا، اس وقت سمندری پانی برفانی چٹانوں glaciers اور برفانی چادروں ice sheets کی شکل میں اکثر براعظمی فرش کو ڈھانکے ہوئے تھا، جس کی وجہ سے سمندری سطح اس کی موجودہ سطح سے

کافی نیچے تھی:

Continental glaciation has been a major cause of sea level fluctuation, creating a rise and fall of ± 130 m (± 425 ft) from present-day sea level.(۷)

"براعظمی برفانیت سطح سمندر کے تفاوت کا ایک بڑا سبب رہا ہے، جس کی وجہ سے اس کی موجودہ سطح میں ۱۳۰ میٹر (۴۲۵ فیٹ) کی کمی اور زیادتی واقع ہوتی رہی ہے"۔

لہذا ماضی میں جب سمندری سطح نیچے تھی اس وقت براعظمی رقبہ اپنے موجودہ رقبے سے تقریباً ایک چوتھائی حصہ بڑا تھا (۸)، اسی طرح ماضی بعید میں کرۂ ارض بعض ایسے ادوار (مثلاً کریٹیشیس عہد createaceous period) سے بھی گزرا ہے جب کہ کرۂ ارض کی برفانی چٹانوں کے پوری طرح پگھل جانے کی وجہ سے سطح سمندر اس قدر اونچی تھی کہ موجودہ براعظموں کا چالیس فیصد سے زائد حصہ زیر آب آگیا تھا، کرۂ ارض کی تاریخ کے وہ ادوار جب کہ براعظموں پر بڑے پیمانے پر برف جم جانے کی وجہ سے سمندری سطح کافی نیچے تھی ان کو برفانی ادوار glacial periods / ice ages کہا جاتا ہے، اسی طرح وہ ادوار جن میں براعظموں کی برف پگھلنے کی وجہ سے سمندری سطح میں زیادتی واقع ہوئی، ان کو بین برفانی ادوار interglacial periods کہا جاتا ہے، کرۂ ارض کی تاریخ میں ایسے ادوار وقفہ وقفہ سے برابر آتے رہے ہیں (۹)، لہذا زیر بحث احادیث میں خشکی اور سمندر کے حقیقی حدود کے تعین کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض پر گزرے ان برفانی ادوار اور ان کے آنے اور ختم ہونے کی وجہ سے سطح سمندر میں تفاوت دونوں کی طرف انتہائی لطیف اشارے بھی موجود ہیں۔

خشکی کا آباد و غیر آباد حصہ: کرۂ ارض پر سمندر اور خشکی کے تناسب (۲:۳) کے بعد حدیث شریف میں خشکی کے آباد (عمران) اور غیر آباد (خراب) حصہ کا تناسب بیان کیا گیا ہے کہ زمین کا آباد علاقہ ۱/۵ - اور غیر آباد علاقہ بھی ۱/۵ ہے، یعنی کہ کرۂ ارض کی خشکی کا نصف حصہ آباد اور نصف خراب ہے، حدیث شریف میں مذکور کرۂ ارض کے خشکی کے علاقے کی یہ تقسیم بھی کافی اہم ہے اور جدید جغرافیائی تحقیقات اس حدیث میں مذکور معانی و مطالب کے بے پناہ اسرار و رموز کی

تصدیق کر رہی ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سب سے پہلے اس حدیث میں مذکور الفاظ "خراب" اور "عمران" کے لغوی معانی سمجھ لینا ضروری ہیں، لغت کی رو سے یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں، لفظ "عمران" عمر، یعمُر سے مشتق ہے جو کسی شئی میں زندگی کے وجود پر دلالت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اسی سے مشتق لفظ "عمر" ہے، جس کا مطلب ہے مدت حیات یعنی کہ کسی بدن میں روح کے باقی اور آباد رہنے کی مدت اور اس کا وقفہ (۱۰) اور عمران آبادی سے معمور منطقہ اور علاقہ کے لئے بولا جاتا ہے، لہذا یہاں عمران سے مراد کرۂ ارض کی خشکی کا وہ علاقہ ہوا جو نباتاتی زندگی کا متحمل اور اس سے معمور ہو، کیوں کہ حیوانات ہی کی طرح نباتات بھی زندگی سے متصف انواع حیات ہیں، لفظ "خراب" عمران کی ضد ہے، جس کے معنی غیر آباد، برباد، بے جان اور بنجر کے ہیں، یعنی کرۂ ارض کی خشکی کا وہ منطقہ جو نباتاتی زندگی کے لئے موزوں یا اہل نہ ہو، قرآن مجید میں بھی جگہ جگہ نباتات سے آباد سرسبز و شاداب زمین کو زندہ اور ناقابل کاشت اور بنجر زمین کو مردہ قرار دیا گیا ہے۔

اس نقطہ نظر سے کرۂ ارض کی خشکی کے علاقے (براعظمی حصہ) کا سائنسی مطالعہ کیا جائے تو کرۂ ارض کے غیر آباد حصہ کو تین حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے، جس کی تقسیم اس طرح ہوگی:

۱-خراب بوجہ غرقابی (زیادتی سمندری سطح)۔

۲-خراب بوجہ براعظمی برفانیت۔

۳-خراب بوجہ صحرا اور ریگستان۔

۱-خراب بوجہ غرقابی: جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ براعظموں (خشکی) کے حقیقی حدود ان حدود سے کہیں زیادہ وسیع ہیں جو آج ہمیں سطح سمندر کے اوپر نظر آرہے ہیں، براعظمی منطقے میں اس کمی کی وجہ کرۂ ارض کی برفانی چٹانوں کے پگھلنے کی وجہ سے سطح سمندر میں زیادتی ہے، لہذا جدید تخمینے کے مطابق براعظموں کے اس غرقاب حصہ کا تناسب کرۂ ارض کے کل رقبہ کا ۱۱ء۳ فیصدی ہے جیسا کہ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، اس اعتبار سے کل خشکی کا تقریباً تین چوتھائی حصہ (۲ء ۲۹ فیصد) موجودہ سطح سمندر کے اوپر ہے جب کہ بقیہ ایک چوتھائی حصہ

(۳ء۱۱ فیصد) زیر آب ہونے کی وجہ سے خراب یا برباد ہے، ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲: براعظمی فرش کا زیر آب حصہ۔
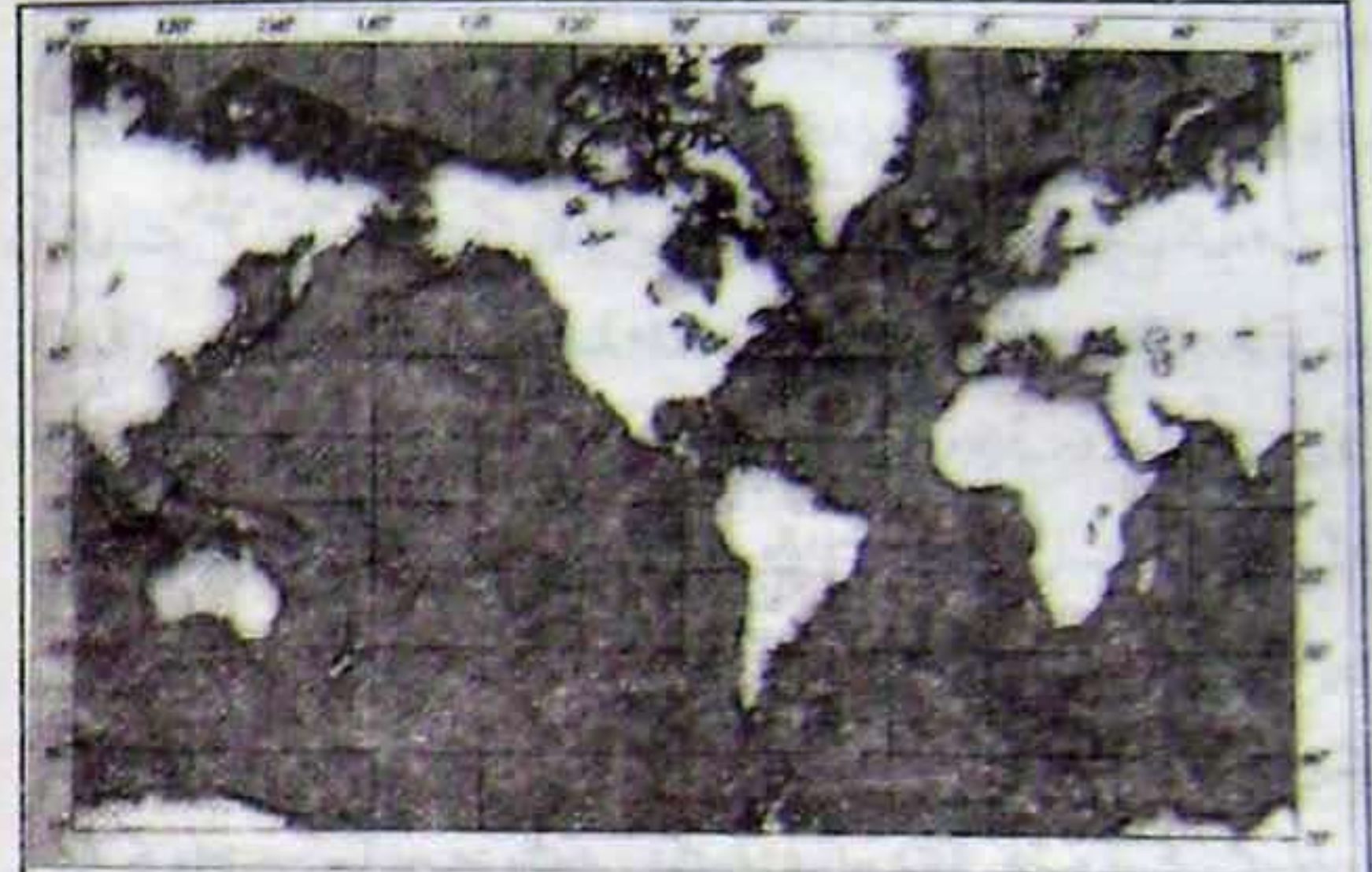
شکل ۲: براعظمی فرش (continental shelf) سمندروں میں ڈوبا ہوا براعظمی حصہ۔ واضح رہے کہ اس تصویر میں سیاہ حصہ صرف براعظمی فرش کی نمائندگی کر رہا ہے، براعظمی ڈھلان کو اس میں نہیں دکھایا گیا ہے۔
(ماخذ: اوشیانوگرافی، انا گمانشن، ویلیس)

۲-خراب بوجہ براعظمی برفانیت: براعظمی حصہ کے ناقابل آباد یا برباد ہونے کی دوسری اہم وجہ براعظمی برفانیت ہے، یعنی وہ برفانی چادریں ہیں جو خشکی کے بڑے حصے کو پوری طرح برف سے ڈھانکے ہوئے ہیں، لہذا قطب جنوبی میں واقع براعظم انٹارٹکا اور قطب شمالی میں واقع گرین لینڈ تقریباً پوری طرح برف سے ڈھکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے یہاں نباتاتی اور حیوانی زندگی تقریباً مفقود ہے، ان براعظموں پر برفانی چادروں کی اوسط موٹائی ۲ تا ۴ کلومیٹر ہے، انٹارٹکا تقریباً مکمل طور پر زیر برف ہے جب کہ گرین لینڈ کا ۵/۴ حصہ برف سے ڈھکا ہوا ہے، لہذا انٹارٹکا میں نباتاتی زندگی اور مستقل انسانی آبادی مفقود ہے جب کہ گرین لینڈ کے بقیہ ۵/۱ حصہ میں جو برف سے خالی ہے چھوٹی آبادیاں پائی جاتی ہیں، کرۂ ارض پر موجودہ براعظمی حصہ کے کل رقبہ کا تقریباً ۱۱ فیصدی حصے کو انٹارٹکا، گرین لینڈ اور دوسرے براعظمی گلیشئرز گھیرے

ہوئے ہیں (۱۱)، جس کی وجہ سے خشکی کا یہ حصہ نباتاتی زندگی کے لئے خراب یا بنجر شمار کیا جاتا ہے، یہ رقبہ کل کرۂ ارض کے رقبے کا ۲۱ء۳ فیصد (3.21 = 100 / (11 x 29.2) ہوتا ہے، ملاحظہ ہو شکل نمبر ۳: انٹارٹکا اور گرین لینڈ کی برفانی چادریں۔

(الف) انٹارٹکا

(ب) گرین لینڈ

شکل ۳: انٹارٹکا اور گرین لینڈ کی برفانی چادریں جو ان دونوں براعظموں کو مکمل طور پر ڈھانپی ہوئی ہیں۔ یہ کرۂ ارض کی موجودہ خشکی کے تقریباً ۹/۱ حصہ کو گھیری ہوئی ہیں۔ (ماخذ: ناسا)

۳-خراب بوجہ صحرا اور ریگستان: براعظموں کا تیسرا منطقہ جو خراب کے زمرہ میں آتا ہے وہ کرۂ ارض کا ریگستانی منطقہ ہے، دنیا کے اکثر ریگستان نیم منطقہ حارہ subtropical regions میں واقع ہونے کی وجہ سے انتہائی گرم اور بنجر علاقے شمار کئے جاتے ہیں، یہاں بارش انتہائی کم یا نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، لہذا یہ علاقے نباتاتی اور حیوانی زندگی کی بقا کے متحمل نہیں ہوتے بلکہ جو لوگ ریگستان میں رہتے ہیں ان کو یہاں کے سخت گرم اور سوکھے موسم کا عادی ہونا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح ریگستان میں پانی کی قلت کی وجہ سے بھی یہاں نباتاتی زندگی تقریباً معدوم ہے۔ جدید تخمینوں کے مطابق کرۂ ارض کے تمام ریگستان موجودہ خشکی کے تقریباً ۷/۱ حصہ کو گھیرے ہوئے ہیں یعنی کہ کل خشکی کا ایک ساتواں حصہ ریگستانوں پر مشتمل ہے (۱۲) اور یہ رقبہ کرۂ ارض کے کل رقبہ کا ۱۷ء۴ فیصد (4.17 = 7 / 29.2) ہوا، ملاحظہ ہو شکل نمبر ۴ کرۂ ارض ریگستان۔

شکل ۳: کرۂ ارض کے ریگستان جو موجودہ خشکی کے ۱/۳ حصہ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ (ماخذ: یو۔ ایس۔ جیولوجیکل سروے)

اوپر ہم نے کرۂ ارض پر سمندر اور خشکی اور پھر خشکی کے آباد اور خراب حصہ پر جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل جدول نمبر ۱ میں ملاحظہ ہو:

منطقہ	رقبہ (ہزار مربع کلومیٹر تقریباً)	تناسب (فیصد)
کرۂ ارض کا کل رقبہ	509,700,000	100%
سمندر کا موجودہ حصہ	361,300,000	70.8%
خشکی کا موجودہ حصہ	148,400,000	29.2%
سمندر کے حقیقی حدود (براعظمی فرش اور براعظمی ابھار کو نکال کر)	303,271,500	59.5%
خشکی کے حقیقی حدود (براعظمی فرش اور براعظمی ابھار کو ملا کر)	206,428,500	40.5%
خشکی کا خراب حصہ بوجہ غرقابی	57,698,040	11.32%
خشکی کا خراب حصہ بوجہ براعظمی برفانیت	16,361,370	3.21%
خشکی کا خراب حصہ بوجہ ریگستان	21,254,490	4.17%
خشکی کا کل خراب حصہ	95,313,900	18.70%
خشکی کا کل آباد حصہ	111,114.600	21.80%

جدول: ۱- کرۂ ارض کے خشکی اور سمندر اور آباد اور خراب منطقہ کا تناسب

جیسا کہ مذکورۂ بالا جدول سے معلوم ہو رہا ہے کہ سمندر کرۂ ارض کے کل رقبے کے تقریباً ۶۰ فیصدی (۳/۵) حصہ کو گھیرے ہوئے ہے جب کہ خشکی تقریباً ۴۰ فیصدی حصہ (۲/۵) پر محیط ہے، اسی طرح خشکی کا تقریباً نصف حصہ خراب یا بنجر شمار کیا جاتا ہے، جس کا تناسب کرۂ ارض کے کل رقبہ کا تقریباً ۱/۵ حصہ ہے، جب کہ خشکی کا مزید نصف حصہ (۲۲ فیصد) آباد شمار کیا جاتا ہے جو کرۂ ارض کے کل رقبہ کا تقریباً ۱/۵ ہوتا ہے، اس طرح یہ اعداد و شمار حدیث میں مذکور حقائق سے مکمل طور پر مطابقت رکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ کرۂ ارض کے اس وسیع منظر نامہ میں آدھا یا ایک فیصدی تفاوت کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس طرح کے تخمینوں میں ایک آدھ فیصد کی کمی بیشی کا امکان margin of error بہر حال موجود رہتا ہے، لہذا احادیث کا اصل مقصد کرۂ ارض کا ایک وسیع منظر نامہ پیش کرنا ہے۔

اس کے بعد اب اس سلسلے کی اگلی حدیث ملاحظہ ہو جس کی تخریج ابن ابی حاتم نے کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ زمین پر غیر آباد (خراب) حصہ کا تناسب ۴/۵ ہے اور آباد حصہ کا تناسب ۱/۵ ہے، لہذا کرۂ ارض کے مذکورہ بالا جغرافیائی اعداد و شمار کی روشنی میں اس کی معنویت بھی از خود واضح ہے کہ اس حدیث میں خراب کے مفہوم میں کرۂ ارض کے سمندر ۳/۵ اور خشکی کا خراب حصہ ۱/۵ دونوں شامل ہیں، لہذا ان دونوں کو جوڑنے سے کرۂ ارض کے کل خراب حصہ کا تناسب ۴/۵ ہوا اور اس حدیث میں ان دونوں کو خراب کہے جانے کی وجہ بھی واضح ہے کہ یہ علاقے نباتاتی زندگی کے لئے متحمل نہیں ہونے کی وجہ سے خراب شمار کئے جاتے ہیں، اس کے بعد اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کرۂ ارض کا بقیہ ۱/۵ حصہ آباد ہے، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

احادیث کا علمی اعجاز اور اصول حدیث: جیسا کہ اس بحث سے واضح ہو گیا کہ کرۂ ارض کے ان دقیق معلومات اور جدید ترین جغرافیائی انکشافات اور حدیث شریف کے بیانات میں بدرجۂ اتم مطابقت اور ہم آہنگی پائی جا رہی ہے اور حدیث کے چند الفاظ ان تمام گوناگوں اور متفرق حقائق کی انتہائی خوب صورتی سے تفسیر و تشریح کر رہے ہیں، لہذا احادیث اور جدید سائنسی تحقیقات کے درمیان اس قدر حیرت انگیز مطابقت سے جو پہلا سائنسی اصول مرتب ہوتا ہے وہ یہ کہ اس قسم کے حقائق کا ماخذ انسانی کلام نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا ماخذ ایک ایسی ہستی ٹھہرتی ہے جس کی نظر اور دست رس میں کائنات کے معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑے تمام مظاہر اور اشیا

ہوں اور ایسی معلومات کا انسان تک اس کی تحقیق وتفتیش سے قبل ہی پہنچ جانا اس سے وحی الٰہی کا اثبات ہوتا ہے اور اس سے اس بات کا اثبات بھی ہوتا ہے کہ وحی کے دائرے میں صرف قرآن ہی نہیں بلکہ حدیث نبوی ﷺ بھی آتی ہے۔

یہاں جو چیز اور زیادہ قابل توجہ اور لائق اعتنا ہے وہ یہ کہ یہاں بحث کی گئی تین احادیث میں سے پہلی دو احادیث جن کو حضرت حسان بن عطیہ نے روایت کیا ہے وہ احادیث مقطوعہ (وہ حدیث جس کی نسبت کسی تابعی کی طرف ہو) ہیں، جب کہ تیسری حدیث جس کو حضرت عبداللہ بن عمرو نے روایت کیا ہے، وہ حدیث موقوف (وہ حدیث جس کی نسبت کسی صحابی کی طرف ہو) ہے، یعنی کہ یہ دونوں اقوال صحابہ اور تابعین کے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے اقوال نہیں ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرو صحابی ہیں جب کہ حضرت حسان بن عطیہ تابعی، لہٰذا اس سے اس اصول حدیث کا منطقی اور سائنسی اثبات بھی ہوتا ہے کہ صحابہ کے ساتھ ساتھ تابعین کے اقوال صحیحہ کا ماخذ بھی اقوال رسول اللہ ﷺ ہی ہے جب کہ نبی کریم ﷺ کے علم کا ماخذ وحی الٰہی ہے، اس طرح آج جدید سائنس سے نہ صرف قرآن کی حقانیت کا بلکہ حدیث نبوی کا بھی اثبات ہو رہا ہے اور حدیث میں احادیث مرفوعہ، احادیث موقوفہ اور احادیث مقطوعہ تمام شامل ہیں۔

حواشی

(۱) دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷، ص ۲۸۱، دانش گاہ پنجاب، پاکستان۔ (۲) العظمۃ: ابوالشیخ، ۴ر ۱۴۱۲؛ الہیئۃ السنیۃ، جلال الدین السیوطی، ص ۴۷، کتاب فی الہیئۃ، ص ۶۷۔ (۳) تفسیر الدر المنثور، جلال الدین سیوطی، ۴ر ۴۲، دار المعرفۃ، بیروت۔ (۴) تفسیر الدر المنثور، جلال الدین سیوطی، ۴ر ۴۲؛ فتح القدیر، شوکانی، ۳ر ۲۶، دار الفکر بیروت۔ (۵) Oceanography: Inagmanson & Wallace, p.83. (۶) حوالہ سابق۔ (۸) حوالہ سابق، ص ۸۶۔ (۸) حوالہ سابق۔ (۹) برفانی ادوار پر تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون: ''کرۂ ارض کے برفانی ادوار اور موسمی تبدیلیاں: قرآن، حدیث اور جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں''۔ (۱۰) المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، ص ۳۴۷، دار المعرفۃ، بیروت۔ (۱۱) Encyclopaedia Britannica 2001 Deluxe Edition CD ROM. Article: Glaciers. (۱۲) ملاحظہ ہو ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا: ۵ر ۱۳۰۔

اندلس کے نامور محدث: بقی بن مخلد

از:- جناب محمد احمد زبیری☆

تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں علم حدیث کے فروغ میں زیادہ تر مصری اور مدنی اسناد کو اہمیت حاصل رہی، اہل اندلس نے علم حدیث کے حصول کے لئے مصر، مدینہ اور حجاز کے شیوخ سے استفادہ کیا، عراق اس زمانے میں حدیث کا بڑا مرکز تھا لیکن عراقی محدثین سے اہل اندلس کے براہ راست استفادے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا (۱)، ابن حبیب اور ان کے دیگر ہم عصر اندلسی علما نے اپنے علمی اسفار کو حجاز تک محدود رکھا، یہ وہ محدثین تھے جنہوں نے سب سے پہلے علوم نبوت اور معارف نبوی سے اپنے دامن کو آراستہ کرنے کے لئے مشرق کی طرف رخت سفر باندھا، انہیں ہم اندلس کے اولین محدثین کہہ سکتے ہیں، اس کی نمایاں وجہ اندلس کی اموی امارت اور بغداد کی عباسی خلافت کی باہمی عداوت بھی تھی لیکن یہ صورت حال عبدالرحمان ثانی کے زمانے میں تبدیل ہونا شروع ہوئی اور اندلس عراقی اثر ونفوذ سے براہ راست متاثر ہونا شروع ہوا، عبدالرحمان ثانی کے زمانے میں بقی بن مخلد، محمد بن وضاح اور صحاح ستہ کے مولفین کے معاصرین اہل اندلس نے عراق کا رخ کیا، بقی بن مخلد کی اندلس میں وہی حیثیت ہے، جو بلاد مشرق میں امام احمد بن حنبل کی ہے، دل چسپ بات یہ ہے کہ بقی بن مخلد نے امام احمد بن حنبل سے استفادہ کیا، انہوں نے بھی ایک ضخیم مسند ترتیب دی، اس عظیم اندلسی محدث کے احوال وآثار آیندہ صفحات میں سپرد قلم کیے جاتے ہیں:

نام ونسب: بقی بن مخلد بن یزید، لقب شیخ الاسلام، کنیت ابوعبدالرحمان الاندلسی القرطبی۔

تاریخ اور مقام پیدائش: وہ شہر قرطبہ میں ۲۱ر رمضان المبارک ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے (۲)،

☆ لیکچرر، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

بعض روایات کے مطابق ان کی پیدائش مندرجہ بالا تاریخ سے دوسال قبل ہوئی تھی، وہ اندلس کے سنہری دور میں پیدا ہوئے، اس زمانے میں اندلس عباسی دربار سے آزاد ریاست تھی اور اس کے چپے چپے سے علم وہنر کے چشمے پھوٹتے تھے۔ (۳)

بقی عالم طفولت میں تھے کہ اندلس اور بغداد کے درمیان علمی ثقافتی اور تجارتی رابطے شروع ہوچکے تھے اور بغداد کے تاجروں نے اندلس کارخ کرلیا تھا، وہ اپنے سامان تجارت لے جانے کے ساتھ اپنے اطوار وعادات اور تہذیب وثقافت کی چھاپ بھی ڈال دیتے تھے، دوسری طرف اندلس سے تشنگانِ علوم کے لئے مشرق کے دروازے کھلے تھے، وہ اپنی علمی پیاس کو بجھانے کے لئے بغداد، بصرہ، کوفہ، ہمدان، یمن اور حرمین کارخ کرتے تھے۔ (۴)

ابتدائی تعلیم: بقی بن مخلد نے ابتدائی تعلیم قرطبہ ہی میں حاصل کی تھی، وہاں کے مشہور فقیہ اور محدث محمد بن عیسیٰ المعافری کی خدمت میں رہے اور اکتساب علم کیا، یہ قرطبہ کے چوٹی کے علما میں سے تھے، روایت وآثار کے عالم تھے، انہوں نے طلب علم کے لئے حجاز اور عراق کا سفر کیا تھا۔ (۵)

اسفار علمیہ: سرزمین اندلس کے علما سے استفادہ کرنے کے بعد وہ مشرق اسلامی کے سفر پر نکلے، یہاں پر علمائے حرمین، مصر، شام، جزیرہ، حلوان، بصرہ، کوفہ، واسط، خراسان، عدن اور قیروان سے استفادہ کیا، امام ذہبی (۷۴۸ھ) کی رائے یہ ہے کہ ان کا خراسان وہمدان جانا تاریخی طور پر ثابت نہیں، نیز جزیرہ اور یمن میں آمد بھی محل نظر ہے (۶) لیکن امام ذہبی (۷۴۸ھ) نے جس رائے کا اظہار کیا اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا۔

بہرحال مشرق میں بقی بن مخلد شہر شہر اور گاؤں گاؤں کا چکر لگا کر علمائے حدیث سے روایات اخذ کرتے تھے اور حج کے موسم میں حرمین شریفین میں ٹھہرتے تھے، اس طرح دنیا کے مختلف کونوں سے آئے ہوئے علمائے دین سے روایت ودرایت کے علوم کا فیض حاصل کرتے تھے (۷)، ان اسفار میں وہ بڑے بڑے مشائخ سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے اور بعض مولفین سے ان کی تالیفات کی اجازت براہ راست حاصل کی، بصرہ میں مشہور محدث اور مورخ خلیفہ بن الخیاط (ت ۲۴۰) سے ان کی کتاب الطبقات اور التاریخ کی اجازت لی، کوفہ میں ابوبکر بن ابی شیبہ سے

ان کی معرکۃ الآرا کتاب ''مصنف'' کی اجازت حاصل کی (۸)، اسی زمانے میں انہوں نے امام احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی حاصل کیا۔

عبدالرحمان بن احمد بن بقی بن مخلد نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنے دادا بقی بن مخلد سے سنا ہے کہ: میں نے مکہ سے بغداد کا سفر کیا، تا کہ امام احمد بن حنبل سے ملاقات کروں، جب میں بغداد کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ امام صاحب اس وقت سخت امتحان اور آزمائش میں ہیں اور کسی کو ان سے ملاقات کی اجازت نہیں، اس بات کا مجھے بے حد صدمہ ہوا، جب بغداد میں داخل ہوا وہاں ایک سرائے میں کرائے پر جگہ لے لی اور پھر جامع مسجد چلا گیا، تا کہ لوگوں سے مل سکوں، میں ایک حلقۂ علمی میں گیا، دیکھا کہ ایک آدمی رجال کے بارے میں درس دے رہا ہے، جب کسی نے بتایا کہ یہ یحییٰ بن معین ہیں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، میں نے عرض کیا کہ آپ احمد بن حنبل کے بارے میں فرمائیں کہ وہ کس پایہ کے آدمی ہیں، انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کہا: کہ ہم جیسے لوگ ''احمد بن حنبل'' کے بارے میں کیا کہیں؟ وہ تو امام المسلمین ہیں اور اس وقت کے مسلمانوں میں بہتر اور افضل شخص ہیں، میں وہاں سے سیدھا احمد بن حنبل کے مکان کی تلاش میں نکلا، پتہ معلوم ہوا تو جاکر دروازے پر دستک دی، امام صاحب نکل آئے تو میں نے عرض کیا: ابوعبداللہ! میں بہت دور سے آیا ہوں اور اس ملک میں یہ میری پہلی آمد ہے، میں آپ سے حدیث وسنت حاصل کرنا چاہتا ہوں، اس لئے آپ کے ہاں حاضر ہوا ہوں، انہوں نے کہا کہ مہمان خانے کے اندر آجائیں لیکن خیال رکھو کہ کوئی کوئی آپ کو دیکھ نہ لے، جب میں اندر گیا تو امام صاحب نے پوچھا: آپ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے جواب دیا: مغرب اقصیٰ سے، انہوں نے کہا: افریقہ سے؟ میں نے کہا: میرا ملک اندلس ہے، سمندر پار کرکے پھر ہم افریقہ میں داخل ہوتے ہیں، امام صاحب نے کہا کہ یقیناً آپ بہت دور سے آئے ہیں لیکن آج کل میں ایک امتحان میں ہوں، شاید آپ کو اس کا علم ہوچکا ہوگا، میں نے کہا ہاں مجھے معلوم ہے، البتہ یہاں پر چونکہ میں نووارد ہوں اور کوئی مجھے جانتا نہیں، اگر آپ اجازت دیں تو میں روزانہ سائل کی حیثیت سے آؤں گا اور اسی طرح آپ کے گھر کے سامنے آواز لگاؤں گا، اس طرح باہر تشریف لانے پر اگر آپ مجھے روزانہ ایک حدیث بھی پڑھاتے رہیں گے تو میرے لئے کافی ہوگا، امام صاحب

نے کہا، بالکل ٹھیک ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کسی کو بتائیں گے نہیں، میں نے کہا یہ شرط مجھے منظور ہے، میں روزانہ چھڑی لے کر ایک میلا کپڑا سر پر باندھتا اور امام صاحب کے دروازے پر آ کر زور سے چیختا ''الاجر رحمک اللّٰہ'' جو اس وقت کے سائلوں کا نعرہ ہوتا تھا، وہ نکلتے اور مجھے دو تین حدیثیں یا اس سے زیادہ سناتے، میں نے اس طریقہ کی پابندی کی حتی کہ امام صاحب پر پابندی لگانے والے شخص کا انتقال ہوگیا۔ (۹)

امام ذہبی (۷۴۸ھ) نے اس واقعہ کو نقل کر کے اس کو بے اصل قرار دیا ہے، اس کے لئے انہوں نے ایک دلیل یہ پیش کی ہے کہ بقی بن مخلد امام احمد کے پاس ۲۳۰ھ کے بعد آئے ہیں جب کہ امام احمد بن حنبل سے (۲۲۸ھ) احادیث کا سلسلہ قطع ہوگیا تھا اور واثق کی موت اور متوکل کی خلافت کے بعد (۲۳۲ھ میں) امام احمد نے روایت حدیث خود ترک کر دی تھی اور اس پر آخر تک جمے رہے تھے، اس کے بعد صرف اسماء الرجال اور فقہ کو موضوع بحث بنایا تھا۔

دوسری دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر بقی بن مخلد امام احمد بن حنبل سے تین سو احادیث سن چکے ہوتے (جیسا کہ بعض روایات میں اس کی تحدید موجود ہے) تو اپنی مسند میں اس کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے، جب کہ میرے پاس مسند بقی کے جو دو اجزا موجود ہیں ان میں امام احمد سے ایک روایت بھی نہیں ہے۔ (۱۰)

امام ذہبی کے اس اعتراض کا مشہور محدث اکرم ضیاء عمری نے ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ اعتراض بالکل کمزور اور ناقابل اعتماد ہے، لکھتے ہیں:

اس روایت کی سند نہایت درجہ قوی ہے، اس کو عبدالرحمان نے اپنے والد احمد اور اس نے اپنے والد بقی سے نقل کیا ہے، عبدالرحمان بن احمد ثقہ اور ضابط ہیں، اپنے لکھنے پر اعتماد کرتے تھے اور اس کے والد احمد بن بقی تو قرطبہ کے ممتاز عابد، زاہد اور قاضی تھے، وہ اپنے والد بقی بن مخلد کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات رکھتے تھے، اس لئے سند کے اعتبار سے یہ واقعہ قوی اور قابل اعتماد ہے۔

امام ذہبی (۷۴۸ھ) کا دوسرا اعتراض اس پر مبنی ہے کہ بقی بن مخلد کی ملاقات امام احمد بن حنبل سے اس زمانے میں ہوئی جب امام صاحب نے خود روایات کرنا ترک کر دیا تھا، اس

بات کے لئے علامہ ذہبی نے کوئی دلیل پیش نہیں کی، نہ تاریخ میں ایسی کوئی حجت ہے جس سے امام ذہبی کی اس بات کا اشارہ ملتا ہو، بلکہ یہ بات تو معلوم اور مسلم ہے کہ بقی بن مخلد کوفہ میں ۲۲۷ھ میں آئے تھے تو کیا کوفہ میں رہتے ہوئے وہ امام احمد کی ملاقات کے لئے نہیں گئے ہوں گے، بہت ممکن ہے کہ واثق باللہ کی وفات جو ۲۲۷ھ میں ہوئی ہے سے قبل دونوں کی ملاقات ہو چکی ہو، البتہ جس روایت میں ہے کہ ''حتی کہ ابتلاء میں ڈالنے والا شخص وفات پا گیا'' تو خطیب کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ واثق باللہ نے خود بھی عقیدہ اعتزال سے رجوع کر کے اہل سنت کا مسلک اختیار کر لیا تھا☆

مسند بقی میں امام احمد کی روایت نہ ہونے کی دلیل بھی اتنی قوی نہیں ہے کیوں کہ امام ذہبی نے تو اس کے دو اجزا کا ذکر کیا ہے کہ ان میں احمد بن حنبل کی روایت نہیں، صرف دو اجزا سے پوری کتاب کے بارے میں رائے قائم کرنے میں کوئی وزن نہیں ہے، واللہ اعلم۔ (۱۱)

اندلس واپسی: حجاز و بغداد کے منابع علم سے سیراب ہونے کے بعد ۲۴۴ھ میں واپس اندلس پہنچے، اس سفر میں انہوں نے روایت و درایت کے ایسے ذخیرے جمع کیے جن کی اجازت مصنفین سے براہ راست حاصل کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اندلس میں ہر طرف مذہب مالکی کی سیادت و قیادت تھی اور ملک کے تمام قابل ذکر علما اس فقہی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، اندلس میں مذہب مالکی امام مالک کے چند شاگردوں کے ذریعے پھیل گیا تھا، جنہوں نے مدینہ منورہ میں براہ راست امام مالک سے علم حاصل کر لیا تھا۔

جب بقی بن مخلد اندلس واپس آ گئے اور اپنی خداداد صلاحیت اور قابل اعتماد علم کی روشنی میں انہوں نے روایات کے مطابق فتوی دینا شر[illegible] اور حدیث کی ایسی نئی کتابیں ساتھ لے

☆ معارف: امام احمد سے بقی بن مخلد کے استفادے کا جو واقعہ اوپر مذکور ہوا ہے وہ روایۃً ممکن ہے درست ہو لیکن درایۃً صحیح نہیں معلوم ہوتا، واثق باللہ کے دور خلافت میں امام احمد پر کوئی سختی تو نہیں کی گئی مگر ان کو جلا وطن کر دیا گیا تھا اور وہ اس کے زمانہ خلافت بھر روپوش رہے، یہاں تک کہ جمعہ و جماعت کے لئے بھی باہر نہیں نکلتے تھے، فتنہ خلق قرآن کا خاتمہ خلیفہ متوکل کے زمانے میں ۲۳۴ھ میں ہوا۔ ''ض''

آئے جواب تک علمائے اندلس کے درمیان معروف نہیں تھی تو اس بات پر اندلس کے علما و مشائخ کے درمیان ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ بات اس وقت کے حاکم امیر محمد بن عبد الرحمان بن الحکم تک پہنچ گئی، اس نے معترضین اور بقی بن مخلد کو یک جا بٹھا کر بقی کے پاس موجود تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اسے خوب سراہا اور حکم دیا کہ ان کی نقول شاہی کتب خانے میں رکھی جائیں، اس کے ساتھ ساتھ اس نے بقی کو علوم کی نشر و اشاعت کی اجازت بھی دی، امیر نے کہا:

"انشر علمک و ارو ما عندک واجلس للناس ینتفعوا بک" اپنے علم کو پھیلاؤ جو علم آپ کے پاس ہے اس کی روایت کرتے رہو اور لوگوں کے لئے بیٹھتے رہو، تاکہ وہ تمہارے علم سے نفع حاصل کریں۔ (۱۲)

وفات: بقی بن مخلد کی وفات بہ روز سہ شنبہ ۲۷/ یا ۲۸/ جمادی الآخر ۲۷۶ھ میں قرطبہ میں ہوئی، ان کی نماز جنازہ ان کے داماد محمد بن یزید نے پڑھائی اور مقبرہ بنی عباس میں ان کی تدفین ہوئی۔ (۱۳)

تقوی اور علمی مرتبہ: حافظ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ بقی بن مخلد نیک اور متقی شخص تھے، کثیر الصیام تھے اور گوشہ نشین تھے، ان امور میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھے اور اپنے شہر میں منفرد (۱۴) حمیدی نے کہا ہے کہ وہ حافظ حدیث، ائمہ دین اور زہاد و صالحین میں سے تھے (۱۵)، ورع و تقوی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے "قضا" کو کبھی قبول نہیں کیا، حالانکہ کئی بار امرائے اندلس نے پیش کش کی تھی اور جب آخر میں ان کے ایک نہایت قدر دان امیر منذر بن عبد الرحمان نے بے حد اصرار کیا تو انہوں نے ایک دوسرے عالم کا نام بتا کر خود اپنے کو اس منصب سے بچا لیا۔ (۱۶)

اساتذہ اور مشائخ: جن مشائخ سے بقی بن مخلد کی ملاقات ہوئی اور ان سے باقاعدہ استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد دو سو چوراسی سے زیادہ بتائی جاتی ہے، کتب تراجم میں جن حضرات کا ذکر ملتا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- ابراہیم بن خالد الکلبی متوفی ۲۴۰ھ۔
۲- ابراہیم بن محمد الشافعی متوفی ۲۳۸ھ۔
۳- ابراہیم بن منذر الحزامی حجازی متوفی ۲۳۶ھ۔
۴- ابراہیم بن ہشام الغسانی۔
۵- احمد بن ابراہیم الدورقی متوفی ۲۴۶ھ۔
۶- احمد بن عبد اللہ بن میمون متوفی ۲۴۶ھ۔

۷- احمد بن عمرو بن السرح ابو الطاہر متوفی ۲۵۵ھ۔
۸- احمد بن محمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ۔
۹- اسحاق بن سعید۔
۱۰- اسماعیل بن عبید الحرانی متوفی ۲۴۰ھ۔
۱۱- بکار بن عبد اللہ بن بشر۔
۱۲- جبارۃ بن مغلس الحمانی متوفی ۲۴۱ھ۔
۱۳- حارث بن مسکین متوفی ۲۵۰ھ۔
۱۴- حرملۃ بن یحییٰ التجیبی المصری متوفی ۲۴۳ھ۔
۱۵- داؤد بن رشید الہاشمی الخوارزمی نزیل بغداد۔
۱۶- زہیر بن حارث۔
۱۷- زہیر بن حرب ابو خیثمہ النسائی متوفی ۲۴۳ھ۔
۱۸- زہیر بن عباد الرؤاسی۔
۱۹- سحنون بن سعید الفقیہ متوفی ۲۴۰ھ۔
۲۰- سلمۃ بن شبیب المسمعی النیشاپوری متوفی ۲۴۰ھ کے بعد۔
۲۱- سوید بن سعد الانباری متوفی ۲۴۰ھ۔
۲۲- شیبان بن فروخ الحبطی متوفی ۲۳۶ھ۔
۲۳- صفوان بن صالح الدمشقی متوفی ۲۳۸ھ۔
۲۴- عباس بن عثمان المودب الدمشقی متوفی ۲۳۸ھ۔
۲۵- عباس بن الولید الخلال الدمشقی متوفی ۲۴۸ھ۔
۲۶- عبد الرحمان بن ابراہیم رحیم متوفی ۲۴۵ھ۔
۲۷- عبد اللہ بن احمد بن ذکوان۔
۲۸- ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ کوفہ میں۔
۲۹- عبید اللہ بن عمر القواریری البصری متوفی ۲۳۵ھ۔
۳۰- عثمان بن محمد بن ابراہیم بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۹ھ۔
۳۱- عمرو بن علی الفلاس متوفی ۲۴۹ھ۔
۳۲- عون بن یونس افریقہ میں۔
۳۳- عیسی بن حماد زغبۃ متوفی ۲۴۸ھ۔
۳۴- القاسم بن عثمان الجوعی الدمشقی۔
۳۵- کثیر بن عبید المدلجی متوفی ۲۵۰ھ۔
۳۶- محمد بن ابان الواسطی متوفی ۲۳۸ھ۔
۳۷- محمد بن بشار بندار متوفی ۲۵۵ھ۔
۳۸- محمد بن ابی بکر المقدمی متوفی ۲۳۴ھ۔

۳۹-محمد بن رمح بن المہاجر التجیبی متوفی ۲۴۲ھ
۴۰-محمد بن عبداللہ بن نمیر متوفی ۲۳۴ھ
۴۱-محمد بن عبید ابن حساب متوفی ۲۳۸ھ۔
۴۲-محمد بن العلاء الکوفی ابو کریب متوفی ۲۴۷ھ۔
۴۳-محمد بن عیسی الاعشی متوفی ۲۲۱ھ۔
۴۴-محمد بن المثنی الزمن ابو موسی متوفی ۲۵۲ھ۔
۴۵-محمد بن مصطفے الحمصی۔
۴۶-محمد بن یحییٰ بن ابی عمر العدنی متوفی ۲۴۳ھ۔
۴۷-محمود بن خالد السلمی الدمشقی متوفی ۲۴۷ھ۔
۴۸-ابو مصعب الزہری الحجازی۔
۴۹-منجاب بن الحارث التیمی الکوفی متوفی ۲۳۱ھ۔
۵۰-ہارون بن عبداللہ الحمال متوفی ۲۴۳ھ۔
۵۱-ہدیۃ بن الخالد القیسی البصری متوفی بعد ۲۳۰ھ۔
۵۲-ہریم بن عبدالاعلی الاسدی البصری متوفی ۲۳۴ھ۔
۵۳-ہشام بن خالد الازرق الدمشقی متوفی ۲۴۹ھ۔
۵۴-ہشام بن عبدالملک البزنی الحمصی متوفی ۲۵۱ھ۔
۵۵-ہشام بن عمار الدمشقی متوفی ۲۴۵ھ۔
۵۶-ہناد بن السری الکوفی متوفی ۲۴۳ھ۔
۵۷-الولید بن عتبہ الاشجعی الدمشقی متوفی ۲۴۰ھ۔
۵۸-یحییٰ بن بشر الحریری الکوفی متوفی ۲۲۷ھ۔
۵۹-یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی متوفی ۲۲۷ھ۔
۶۰-یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر المصری متوفی ۲۲۸ھ۔
۶۱-یحییٰ بن یحییٰ اللیثی القرطبی۔
۶۲-یعقوب بن حمید بن کاسب المدنی نزیل مکہ متوفی ۲۴۰ھ۔(۱۷)

تلامذہ: کتب تراجم میں ان کے تلامذہ کا نام تفصیل کے ساتھ موجود نہیں، ان کے تبحر علمی کا چرچا پورے اندلس کے ساتھ حجاز اور بغداد میں بھی ہو چکا تھا، ان کے ایک ساتھی احمد بن ابی خیثمہ کا بیان ہے کہ ہم نے ان کا نام مکنسۃ (جھاڑو) رکھا تھا کہ جہاں بقی بن مخلد ہوتے تھے، تشنگان علم کو اپنی طرف کھینچ لیتے، کوئی کسی دوسرے درس میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا، ایک معاصر عالم کی یہ شہادت کتنی وزنی ہے، اس سے بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے کہ بقی بن مخلد سے استفادہ کرنے والے تشنگان علم کی تعداد کیا ہوگی؟ اہل مشرق کا بقی بن مخلد سے استفادے کا بہت کم ذکر

ملتا ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جب بقی بن مخلد مشرق میں تھے اس وقت ان کے اساتذہ و مشائخ زندہ تھے، جن سے لوگ مسلسل استفادہ کرتے رہتے تھے اور جس وقت ان کے مشائخ دنیا میں نہیں رہے تو وہ واپس اندلس جا چکے تھے، مصر و افریقہ میں بھی (قلیل تعداد میں) طالبان علوم نبوت نے ان سے استفادہ کیا ہے، بقی بن مخلد کے اپنے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

"لما قدمت من العراق علی یحیی بن بکیر اجلسنی الی جنبہ و سمع منی سبعۃ احادیث"۔(۱۸)

جب میں عراق سے آیا تو یحییٰ بن بکیر نے اپنے ساتھ بٹھالیا اور سات احادیث مجھ سے سنیں۔

نیز کہتے ہیں:

"قدمت علی سحنون فکان ابنہ محمد یسمع علی فی داخل بیت سحنون بمحضر سحنون"۔(۱۹)

میں سحنون کے پاس آیا تو اس کے گھر پر اس کا بیٹا سحنون کی موجودگی میں مجھ سے احادیث سنتا تھا۔

ان کے شاگردوں میں مندرجہ ذیل مشائخ کا نام ملتا ہے:

۱-احمد بن بقی بن مخلد
۲-احمد بن خالد بن یزید
۳-احمد بن عبداللہ بن محمد بن المبارک الاموی ابو القاسم
۴-اسلم بن عبدالعزیز بن ہشام القاضی۔
۵-ایوب بن سلیمان المری
۶-حسن بن سعد بن ادریس البربری۔
۷-عبداللہ بن یونس المرادی۔
۸-عبدالواحد بن حمدون۔
۹-علی بن عبدالقادر بن ابی شیبہ الاندلسی۔
۱۰-محمد بن عمر بن لبانہ۔
۱۱-محمد بن قاسم بن محمد۔
۱۲-محمد بن وزیر۔
۱۳-مروان بن عبدالملک القیسی۔
۱۴-مہاجر بن عبدالرحمان۔
۱۵-نمر بن ہارون بن رفاعہ العبسی۔
۱۶-ہشام بن الولید الغافقی۔(۲۰)

بقی بن مخلد کی تالیفات

۱-التفسیر الکبیر: بقی بن مخلد کی تالیفات میں سب سے اہم کتاب "التفسیر الکبیر" ہے،

علامہ ابن حزم ظاہری اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

هو الكتاب الذی اقطع قطعا لا استثنی فیه انه لم یؤلف فی الاسلام مثله ولا تفسیر محمد بن جریر الطبری ولا غیره ۔(۲۱)

میں قطعی طور پر بلا استثنا کہتا ہوں کہ اسلام کی پوری تاریخ میں اس جیسی کتاب نہیں لکھی گئی، حتی کہ محمد بن جریر طبری اور دیگر مولفین کی تفاسیر بھی اس کی ہم پلہ نہیں۔

۲-المسند الکبیر: دوسری اہم کتاب، بقی بن مخلد کی مسند ہے، جس کے بارے میں ابن حزم لکھتے ہیں:

رتبه علی أسماء الصحابة رضی الله عنهم فروی فیه عن الف و ثلثمائة صاحب ونیف ثم رتب حدیث کل صاحب علی اسماء الفقه وابواب الاحکام وهو مصنف و مسند ولا اعلم هذه الرتبه لأحد قبله مع ثقته و ضبطه واتقانه واحتفاله فی الحدیث وجودة شیوخه فانه روی عن مائتی رجل واربعة وثمانین رجلا لیس فیهم عشرة ضعفاء وسائرهم اعلام مشاهیر ۔(۲۲)

انہوں نے یہ کتاب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ناموں اور فقہی ابواب کی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر ترتیب دی ہے۔ جس میں تیرہ سو سے زائد صحابہ کرام کی مرویات کو انہوں نے جمع کیا ہے، انہوں نے ہر صحابی کی احادیث کو یک جاذکر کیا ہے اور فقہی ابواب کی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اس اعتبار سے یہ بیک وقت مسند بھی ہے اور مصنف بھی ہے، میرے علم کی حد تک آج تک کسی کو یہ بلند رتبہ نہیں ملا جو ثقاہت، ضبط و اتقان اور حدیث کا اس قدر کثیر علم رکھتا ہو اور جس کے شیوخ بھی بلند پایہ ہوں، انہوں نے اس مسند میں دو سو چوراسی شیوخ سے احادیث نقل کی ہیں اور ان میں دس بھی ضعیف راوی نہیں ہوں گے، یہ سارے کے سارے شیوخ مشہور علما ہیں۔

طاہر بن عبدالعزیز کہتے ہیں:

حملت مع نفسی جزءا من مسند ابی عبد الرحمان بقی بن مخلد الی المشرق فاریته محمد بن اسماعیل الصائغ فقال ما اغترف هذا الا من بحر علم و عجب من کثرة علمه ۔(۲۳)

میں جب مشرق گیا تو اپنے ساتھ عبدالرحمان بقی بن مخلد کی مسند کا کچھ حصہ بھی لے گیا، جب یہ کتاب میں نے محمد بن اسماعیل صائغ کو دکھائی تو وہ مولف کے علمی رتبے سے حیران ہوئے اور کہا کہ علم کے سمندر سے چلو بھر کے لائے ہو۔

ابن الفرضی (۴۰۳ھ) کہتے ہیں:

لیس لاحد مثله ۔(۲۴)

کسی نے اس کتاب جیسی تالیف مرتب نہیں کی۔

ابن الجوزی لکھتے ہیں:

روی فیه عن الف وستمائة صحابی بل یزیدون علی هذا العدد ۔(۲۵)

اس مسند میں سولہ سو صحابہ کرام سے روایات نقل کی گئی ہیں بلکہ ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔

ابن کثیر نے بھی یہ تعداد نقل کی ہے اور بہ ظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ابن کثیر نے یہ تعداد ابن الجوزی سے نقل کی ہے، ہوسکتا ہے ابن الجوزی کی عبارت میں تحریف ہوگئی ہو اور اصل تعداد تیرہ سو ہی ہو لیکن سولہ سو نقل ہوگئی ہو کیوں کہ ابن الجوزی نے بقی بن مخلد کے مرتب کردہ جدول کو دیکھا ہے اور اس کے ذریعے تعداد کا اندازہ لگایا ہے۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ "ابن حزم، مسند بقی بن مخلد کو مسند احمد پر ترجیح دیتے ہیں" لیکن میرے خیال میں یہ بات محل نظر ہے کیوں کہ مسند احمد بہر حال مسند بقی بن مخلد پر فوقیت رکھتی ہے (۲۶) لیکن ابن کثیر کے اس قول کی کیا بنیاد ہے؟ حالاں کہ انہوں نے صراحت نہیں کی کہ آیا انہوں نے مسند بقی بن مخلد کو دیکھا ہے یا نہیں اور اس کے بغیر انہوں نے مسند احمد بن حنبل کی فوقیت کا فیصلہ کیسے دے دیا؟

بقی بن مخلد نے ایک دل چسپ واقعہ بھی اس مسند کے بارے میں نقل کیا ہے جو اس مسند کی تالیف کے وقت پیش آیا:

"جب میں نے اپنی اس مسند کو ترتیب دیا تو میرے پاس عبید اللہ بن یحییٰ اور اس کا بھائی اسحاق آئے اور انہوں نے کہا، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایک مسند مرتب کی ہے جس میں ابومصعب اور ابن بکیر کو آپ نے پہلے ذکر کیا ہے اور ہمارے والد کو بعد میں ذکر کیا ہے، بقی کہتے ہیں" میں نے ابومصعب کو اس لئے پہلے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

فقدموا قریشاً ولا تقدموها ۔(۲۷) قریش کو مقدم رکھو اور اس پر سبقت نہ لے جاؤ۔

اور ابن بکیر کو میں نے اس کی بزرگی کی وجہ سے مقدم کیا ہے کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے "کبر کبر" اس کے علاوہ ابن بکیر نے امام مالک سے دس مرتبہ موطا سنی ہے اور تمہارے والد نے صرف ایک مرتبہ موطا سنی ہے۔

بقی کہتے ہیں وہ دونوں میرے پاس سے اٹھ کر چلے گئے اور اس کے بعد کبھی نہیں آئے اور انہوں نے میرے ساتھ عداوت کا رویہ اختیار کرلیا"۔(۲۸)

مسند بقی بن مخلد کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ مشرق کے چند اکابر علمائے حدیث ان سے واقف ہوچکے تھے، امام ذہبی (۷۴۸ھ) نے تو صاف لکھا ہے کہ میرے پاس مسند بقی کے دو جز موجود ہیں، نیز حافظ ابن حجر کے ذخیرۂ کتب میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، حافظ کے پاس مسند بقی کا ایک نسخہ موجود تھا۔

دور حاضر میں کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ اس نے مسند بقی بن مخلد کا کوئی نسخہ دیکھا ہے، ہندوستان کے ایک معروف عالم دین صاحب تحفۃ الاحوذی[1] نے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ حرمین کے کتب خانے میں موجود ہے، باقی تفصیل انہوں نے ذکر نہیں کی۔

ڈاکٹر ضیاء العمری لکھتے ہیں:

وقد فتشت فی مکتبات برلین وکوته ولا یبزک فلم اقف علی اثر لمسند بقی بن مخلد ولکن توجد مجموعة کبیرة من المخطوطات العربیه فی مکتبة برلین لم تفهرس بعد وکذالک مکتبة برلین الشرقیة حیث لم تفهرس مخطوطاتها بعد ولکن لا ازال ثمة امل فی العثور علیه فی المکتبات الخاصة و بعض المکتبات العامة وخاصه فی مکتبة برلین الغربیة وبلاد المغرب و ترکیا ونحن نعلل النفس بذالک ۔(۲۹)

میں نے برلن، کوتہ اور لائبزک کے کتب خانے چھان لیے لیکن مجھے مسند بقی بن مخلد کی کوئی نشانی نہیں ملی تاہم برلن کے کتب خانے میں عربی مخطوطات کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے جس کی فہرست ابھی نہیں بنی ہے، اسی طرح مشرقی برلن کے کتب خانے کے قلمی نسخوں کی فہرستیں ابھی نہیں بنی ہیں، ابھی تک یہ امید برقرار ہے کہ کسی شخصی کتب خانے یا عام کتب خانے میں جن میں برلن، مغرب اور ترکی کے کتب خانے شامل ہیں اس کا کوئی نسخہ دریافت ہوجائے گا اور ہم اس تسلی کے ساتھ اپنے دل کو بہلاتے ہیں۔

[1] معارف: یعنی مولانا عبدالرحمان مبارک پوری جنہوں نے جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی کے نام سے لکھی تھی مولانا نے حرمین کے بجائے جرمنی میں اس کے نسخے کی نشان دہی کی تھی۔

احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد: تراجم اور صحابہ کرام کے حالات زندگی پر لکھی جانے والی کتب میں محدثین اور اسماء الرجال کے ماہرین نے ہزاروں صحابہ کرام کے حالات زندگی کو قلم بند کیا ہے، ابن حجر کی کتاب "الاصابہ" میں ۱۲۳۰۴ صحابہ کرام کے حالات ملتے ہیں، ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی ہیں جن کو شرف صحابیت حاصل نہیں ہے اور تابعین کے طبقے میں آتے ہیں، اس کی تفصیل اور اسباب ابن حجر نے الاصابہ کے مقدمے میں بیان کی ہے، حافظ ذہبی (۷۴۸ھ) لکھتے ہیں کہ اسد الغابہ میں ابن الاثیر (۶۳۰ھ) نے ۷۵۵۴ اور صحابہ کرام کے حالات لکھے ہیں (۳۰) لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں بعض حضرات یقیناً صحابہ نہیں ہیں، حافظ ذہبی نے اسد الغابہ میں مذکور ایسے حضرات کے ذکر کو حذف کر کے دیگر صحابہ کرام کے حالات زندگی کو "تجرید اسماء الصحابہ" میں یک جا ذکر کیا ہے، اس طرح صحابہ کرام کی تعداد اس کتاب کے مطابق ۸۸۶۶ ہوجاتی ہے لیکن اس تجرید اسماء الصحابہ کا بھی وہی معاملہ ہے کہ بعض حضرات ایسے آگئے ہیں جن کی صحابیت یقینی نہیں ہے۔

ابن حجر نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی کتاب "الاصابہ" میں صحابہ کرام کی کل تعداد کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے، ابوزرعہ رازی نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو جن

حضرات نے آپ ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ سے احادیث سنیں، ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی اور ان سب نے آپ ﷺ سے احادیث کو سماعت کی بنا پر یا رؤیت کی بنیاد پر روایت کیا ہے۔

یہ قدرتی بات ہے کہ صحابہ کرام کی تعداد کے حوالے سے کوئی قطعی تعداد معلوم نہیں ہے لیکن امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے وقت صحابہ کرام کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، ان میں تیس ہزار مدینہ کے باشندے تھے اور باقی تیس ہزار دیگر عرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن اس قول پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ بھی محض اندازہ ہے اور ابوزرعہ کے مذکورہ بالا قول کے ساتھ بھی متصادم ہے، ابوزرعہ کہتے ہیں:

شهد حجة الوداع اربعون الفا وكان معه بتبوك سبعون الفا۔(۳۱)

حجۃ الوداع میں چالیس ہزار صحابہ کرام تھے جب کہ غزوہ تبوک میں آپ ﷺ کے ساتھ ستر ہزار صحابہ کرام تھے۔

لیکن یہ قول محل نظر ہے کیوں کہ بخاری اور مسلم میں غزوہ تبوک کے شرکا کی تعداد کے حوالے سے آیا ہے کہ:

ان الناس كثير لا يحصيهم ديوان۔

لوگ اتنی کثیر تعداد میں تھے کہ ان کی تعداد کسی رجسٹر میں درج نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ باقاعدہ مردم شماری اور اس کا ریکارڈ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مرتب کیا گیا۔

سفیان ثوری سے نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت صحابہ کرام کی تعداد کا اندازہ بارہ ہزار لگایا، حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت اکثر صحابہ کرام یا تو دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا ان میں سے بہت سارے غزوات میں شہید ہو چکے تھے۔(۳۲)

ابوزرعہ رازی کے اندازے کے مطابق صحابہ کرام کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی جنہوں نے آپ ﷺ کو دیکھا یا آپ ﷺ سے ان کی سماعت حدیث ثابت ہے لیکن یہ تعداد ان سب صحابہ کرام کی ہے جنہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا، چاہے انہیں سماعت حدیث کا موقع ملا یا نہیں ملا لیکن اس قول سے بھی احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام کی صحیح تعداد کا اندازہ

نہیں لگایا جاسکتا۔

لیکن اس معاملے میں کوئی شک نہیں کہ بہت سارے صحابہ کرام کی احادیث ہم تک نہیں پہنچیں، امام حاکم نیشاپوری (۴۰۵ھ) نے احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے جب کہ علامہ ذہبی کا خیال ہے کہ ان کی تعداد پندرہ سو ہے دو ہزار بھی نہیں۔

احادیث کے راوی صحابہ کرام کی تعداد کے حوالے سے علامہ ذہبی کا اندازہ قرین صحت ہے، ابن جوزی نے صحابہ کرام کی تعداد کا جو جدول مرتب کیا ہے، اس کے مطابق صحابہ کرام کی تعداد ۱۸۵۸ ہے (جن میں ۱۶۴۲ صحابہ ہیں اور ۲۱۶ صحابیات ہیں) ان میں سے بھی بعض کی روایت احادیث ثابت نہیں ہے، امام احمد نے اپنی مسند میں جن صحابہ کرام یا صحابیات کی احادیث نقل کی ہیں ان کی تعداد ۹۰۴ ہے اور جن صحابہ کرام کا ذکر بقی بن مخلد نے اپنی مسند میں کیا ہے اور امام احمد نے ان کا ذکر نہیں کیا، ان کی تعداد ۵۶۸ ہے، اس کے علاوہ ابوبکر البرقی نے اپنی فہرست میں جن صحابہ کا اضافہ کیا ہے جن کا ذکر نہ امام احمد نے کیا ہے اور نہ بقی بن مخلد نے کیا ہے، ان کی تعداد ۸۷ ہے، اس تعداد میں ابن جوزی نے دیگر مصادر کی مدد سے جو اضافہ کیا ہے وہ چھ ہے، اس طرح احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام کی مجموعی تعداد ۱۵۶۵ ہو جاتی ہے لیکن اس تعداد میں بھی وہ راوی شامل ہیں جو کہ صحابہ نہیں ہیں بلکہ تابعین ہیں جیسا کہ مسند بقی بن مخلد میں بعض تابعین کو مرسل احادیث روایت کرنے کی بنیاد پر صحابی شمار کیا گیا ہے، اس اعتبار سے علامہ ذہبی کا اندازہ درست ہے اور امام حاکم کی بیان کردہ تعداد بہت زیادہ ہے۔

مسند بقی بن مخلد کے حوالے سے ابن حزم کا قول بھی محل نظر ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ اس میں ۱۳۰۰ سے کچھ زائد صحابہ سے احادیث جمع کی ہیں لیکن یہ قول ابن حزم کے مرتب کردہ فہرست سے مطابقت نہیں رکھتا جس میں انہوں نے ایک ہزار تیرہ صحابہ کرام یا صحابیات کا ذکر کیا ہے، باقی راوی کہاں گئے اس کے بارے میں انہوں نے وضاحت نہیں کی۔(۳۳)

مسند احمد اور مسند بقی کا تقابل: ۱-جن صحابہ کرام کی احادیث مسند احمد میں آئی ہیں شیخ البانی کی فہرست کے مطابق ان کی تعداد ۹۰۴ ہے جب کہ مسند بقی میں ایک ہزار تیرہ صحابہ کرام کی احادیث ذکر کی گئی ہیں لیکن مسند بقی میں بعض تابعین کو بھی صحابی سمجھا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا

ہے، حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اس کی وضاحت کی ہے۔(۳۴)

۲-مسند بقی میں مذکور کل احادیث کی تعداد ۳۰۹۶۹ ہے جب کہ مسند احمد میں عبداللہ کی زیادات کے علاوہ مذکورہ احادیث کی تعداد تیس ہزار ہے۔

۳-بعض صحابہ کرام کی مرویات کی تعداد مسند بقی میں زیادہ ہے جب کہ مسند احمد میں اسی صحابی کی روایت کردہ احادیث کی تعداد کم ہے، مثلاً مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کی تعداد ۳۸۷۹ ہے اور مسند بقی میں حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔

اس طرح حضرت عبداللہ بن عمر کی مرویات کی تعداد مسند بقی بن مخلد میں ۲۲۱۰ ہے جب کہ مسند احمد بن حنبل میں ان کی تعداد ۲۰۲۹ ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ کی مرویات کی تعداد مسند بقی میں ۱۵۷ اور مسند احمد بن حنبل میں ۵۳ ہے، حضرت انس کی مرویات کی تعداد مسند بقی میں ۲۲۸۶ اور مسند احمد میں ۲۱۹۲ ہے، بعض اوقات مسند احمد میں بعض صحابہ کی مرویات کی تعداد زیادہ ہے اور مسند بقی بن مخلد میں کم ہے، مثلاً مسند احمد میں حضرت علیؓ کی مرویات کی تعداد ۸۱۹ ہے لیکن مسند بقی میں ۵۸۶ ہے پھر مرویات کی تعداد کا یہ اختلاف سلسلہ سند میں ہے، متن کے اندر کس قدر فرق پایا جاتا ہے یہ امر قابل غور ہے۔

۴-اگرچہ بقی بن مخلد امام احمد بن حنبل کے شاگرد رہے ہیں لیکن مسند بقی ان سے استفادے کا نتیجہ نہیں ہے، بقی بن مخلد نے ۲۸۴ شیوخ سے روایات کو اپنی مسند میں جمع کیا ہے، ان میں دس بھی ضعیف نہیں ہیں بلکہ سب کے سب مشاہیر اور بڑے بڑے محدثین ہیں، یہ قول ابن حزم کا ہے جنہوں نے مسند بقی بن مخلد کو دیکھا ہے جب کہ مسند احمد میں امام احمد بن حنبل نے ۲۸۳ شیوخ سے احادیث کو نقل کیا ہے، علامہ ذہبی نے مسند بقی کی دو جلدیں دیکھنے کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کوئی حدیث بھی امام احمد سے روایت نہیں کی گئی۔

۵-بقی بن مخلد نے اپنی مسند کو بڑی احتیاط اور جانچ پرکھ کے بعد مرتب کیا ہے، ابن حجر کے مطابق انہوں نے اسحاق بن راہویہ کے اسلوب کو اپنایا ہے، ابن حزم مسند بقی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وما اعلم هذه الرتبة لاحد قبله

میرے علم کی حد تک آج کسی کو یہ بلند رتبہ نہیں

مع ثقته وضبطه واتقانه واحتفاله فيه في الحديث وجودة شيوخة فانه روى عن مائتي رجل واربعة وثمانين رجلا ليس فيهم عشرة ضعفاء وسائرهم اعلام مشاهير

ملا، جو ثقاہت، ضبط و اتقان اور حدیث کا اس قدر کثیر علم رکھتا ہو اور جس کے شیوخ بھی بلند پایہ ہوں، انہوں نے اس مسند میں ۲۸۴ شیوخ سے احادیث نقل کی ہیں، ان میں دس بھی ضعیف نہیں ہوں گے بلکہ سب نامور علما اور مشاہیر محدثین ہیں۔

۶-جہاں تک دونوں مسانید کی ترتیب اور حسن تالیف کا تعلق ہے تو مسند بقی بن مخلد، مسند احمد پر فوقیت رکھتی ہے کیوں کہ یہ مسند بھی ہے اور مصنف بھی ہے یعنی ہر صحابی کی احادیث کو فقہی ابواب کی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے اور یہ نادر اسلوب اس سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا۔

۷-سند عالی کے معاملے میں مسند احمد، مسند بقی پر فوقیت رکھتی ہے کیونکہ امام احمد بقی بن مخلد کے شیوخ میں سے ہیں۔

۸-ابن کثیر مسند احمد کو مسند بقی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن انہوں نے وضاحت نہیں کی کہ آیا انہوں نے خود مسند احمد کو دیکھا ہے یا نہیں۔(۳۵)

۹-مسند احمد کے ۱۲۷ اجزا ہیں جب کہ مسند بقی دو سو اجزا پر مشتمل ہے(۳۶) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسند احمد کی ضخامت کم ہے کیوں کہ اجزا کا تعلق کاغذ کے سائز اور رسم الخط کے فرق کی وجہ سے مختلف ہے۔

۱۰-دونوں مسانید میں مرویات کا اختلاف مقلین صحابہ میں ہے مکثرین میں نہیں۔

(ا) جن صحابہ کی مرویات کی تعداد بیس سے زیادہ ہے ان دونوں کی مرویات دونوں میں یکساں ہیں۔

(ب) جن صحابہ کرام کا ذکر بقی نے کیا ہے اور امام احمد نے نہیں کیا ان کی تعداد اکتیس ہے، جن میں تین، دو اور ایک احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام شامل نہیں۔

(ج) جن صحابہ کی مرویات تین یا دو ہیں اور انہیں بقی نے ذکر کیا ہے اور امام احمد نے ذکر نہیں کیا، ان کی تعداد ۸۲ ہے۔

(د) ایک حدیث روایت کرنے والے صحابہ جنہیں امام احمد نے ذکر نہیں کیا اور مسند بقی میں ان کا ذکر آیا ہے ان کی تعداد ۳۳۴ ہے۔

(ہ) مجموعی طور پر جن صحابہ کا ذکر مسند بقی میں ہے اور مسند احمد میں نہیں ان کی تعداد ۵۶۸ ہے۔

مسند احمد اور مسند بقی ایک نظر میں

موضوع	مسند احمد	مسند بقی
کل احادیث	۳۰۰۰۰	۳۰۹۶۹
راوی صحابہ کی تعداد	۹۰۴	۱۰۱۳
حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات	۳۸۷۹	۵۳۷۴
حضرت عمرؓ کی مرویات	۳۱۰	۵۳۷
حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرویات	۲۰۲۹	۲۲۱۰
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مرویات	۹۰۰	۸۴۸
حضرت علیؓ کی مرویات	۸۱۹	۵۸۶
حضرت عائشہؓ کی مرویات	۱۳۴۰	۲۲۱۰
حضرت معاذ بن جبلؓ کی مرویات	۵۳	۱۵۷
حضرت انس بن مالکؓ کی مرویات	۲۱۹۲	۲۲۸۶
اجزا کی تعداد	۱۲۷	۲۰۰
شیوخ کی تعداد	۲۸۳	۲۸۴

۳- مصنف فی فتاوی الصحابة والتابعین ومن دونهم تفسیر اور مسند کے علاوہ بقی بن مخلد کے علمی آثار میں ایک مصنف کا ذکر بھی ملتا ہے، اس کے بارے میں ابن حزم لکھتے ہیں:

اربی فیه علی مصنف ابی بکر بن ابی شیبة و مصنف عبد الرزاق بن همام و مصنف سعید بن منصور

بقی بن مخلد اس مصنف کی ترتیب و تصنیف میں مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق بن ہمام اور مصنف سعید بن منصور وغیرہ پر

وغیرها وانتظم علما عظیما لم یقع فی شئی من هذه ۔(۳۷)

سبقت لے گئے ہیں، انہوں نے اس مصنف میں علم کا بڑا ذخیرہ سمو دیا ہے۔

کتانی اپنی مشہور کتاب الرسالۃ المستطرفہ میں لکھتے ہیں:

وهو کتاب شهیر و جامع کبیر خرج اکثر احادیث الشیخان والاربعة ۔(۳۸)

یہ کتاب بڑی مشہور اور احادیث کے بڑے ذخیرے پر مشتمل ہے، اس کی اکثر احادیث بخاری اور مسلم اور اصحاب سنن نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔

۴- ماروی فی الحوض والکوثر یہ کتاب بھی نایاب ہے لیکن جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، اس میں بقی نے حوض اور کوثر کے متعلق احادیث کو جمع کیا ہوگا اور یہ ایک مختصر کتاب یا کتابچہ ہوگی کیوں کہ اس موضوع پر زیادہ روایات نہیں ملتیں۔

۵- عدد ما لکل واحد من الصحابة من الحدیث یہ کتاب دراصل ایک فہرست ہے جس میں بقی بن مخلد نے احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد، ان کے اسمائے گرامی اور ان کی روایات یا احادیث کی تعداد ذکر کی ہے، اس کتاب کو ابن حزم (۴۵۶ھ) نے ترتیب دیا ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں، ایک نسخہ شام کے مکتبہ ظاہریہ میں ہے، ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے اس کی فوٹو کاپی کر کے اسے شائع کیا ہے، اس کا خلاصہ ذیل کے جدول سے واضح ہوتا ہے۔

جدول نمبر۲

نمبر شمار	راویان احادیث کی قسم	احادیث کی تعداد	احادیث روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد
۱	ہزاروں احادیث روایت کرنے والے	۱۲۴۰۰	۴
۲	ہزار احادیث روایت کرنے والے	۴۳۷۰	۳
۳	دوسو احادیث روایت کرنے والے	۴۵۱۶	۱۰
۴	سو احادیث روایت کرنے والے	۳۱۰۰	۲۱

نمبر شمار	راویان احادیث کی قسم	احادیث کی تعداد	احادیث روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد
۵	دسیوں احادیث روایت کرنے والے	۳۸۱۰	۹۱
۶	انیس احادیث روایت کرنے والے	۳۸	۲
۷	اٹھارہ احادیث روایت کرنے والے	۱۰۸	۶
۸	سترہ احادیث روایت کرنے والے	۵۱	۳
۹	سولہ احادیث روایت کرنے والے	۴۸	۳
۱۰	پندرہ احادیث روایت کرنے والے	۶۰	۴
۱۱	چودہ احادیث روایت کرنے والے	۱۵۴	۱۱
۱۲	تیرہ احادیث روایت کرنے والے	۹۱	۷
۱۳	بارہ احادیث روایت کرنے والے	۱۰۸	۹
۱۴	گیارہ احادیث روایت کرنے والے	۹۹	۹
۱۵	دس احادیث روایت کرنے والے	۱۴۰	۱۴
۱۶	نو احادیث روایت کرنے والے	۱۰۸	۱۲
۱۷	آٹھ احادیث روایت کرنے والے	۱۴۴	۱۸
۱۸	سات احادیث روایت کرنے والے	۱۹۶	۲۸
۱۹	چھ احادیث روایت کرنے والے	۱۶۲	۲۷
۲۰	پانچ احادیث روایت کرنے والے	۱۴۰	۲۸
۲۱	چار احادیث روایت کرنے والے	۲۱۲	۵۳
۲۲	تین احادیث روایت کرنے والے	۲۱۶	۷۲
۲۳	دو احادیث روایت کرنے والے	۲۴۰	۱۲۰
۲۴	ایک حدیث روایت کرنے والے	۴۵۸	۴۵۸
	کل میزان	۳۰۹۲۹	۱۰۱۳

بقی کی فہرست اور دیگر فہارس کا تقابل: صحابہ کرام کی مرویات کی تعداد کے ضمن میں بقی بن مخلد کی فہرست منفرد حیثیت کی حامل ہے، اس کے علاوہ ابوبکر احمد بن عبداللہ البرقی (۲۷۰ھ) نے بھی اس موضوع پر کام کیا ہے، اس کی ایک کتاب ''تاریخ'' کے عنوان سے ہے اور دوسری تالیف ''معرفۃ الصحابہ'' کے عنوان سے ہے لیکن یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا یہ دونوں الگ الگ کتابیں ہیں یا ایک ہی تصنیف کے دو نام ہیں، حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اس سے اقتباس دیا ہے، برقی کے حوالے سے حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ وہ حافظ حدیث اور اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔(۳۹)

ان دونوں کتابوں (فہارس) کے تقابل سے یہ بات سامنے آتی ہے، جیسا کہ ابن جوزی نے ''تلقیح فہوم اہل الاثر'' کے اندر بیان کیا ہے کہ بعض اوقات برقی نے بقی بن مخلد سے زیادہ تعداد میں احادیث صحابہ کی طرف منسوب کی ہیں، مثلاً ابوبکر برقی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت انس بن مالک کی مرویات کی تعداد پچاس ہے جو کہ اہل مصر نے ان سے روایت کی ہیں، صرف ایک حدیث ایسی ہے جو اہل شام نے ان سے روایت کی ہے جب کہ بقی بن مخلد حضرت انس کی مرویات کی تعداد تیس بیان کرتے ہیں۔(۴۰)

حارث بن البرصاء کی جانب برقی چار احادیث منسوب کرتے ہیں اور بقی بن مخلد انہیں دو احادیث روایت کرنے والے صحابہ میں شمار کرتے ہیں، عبدالرحمان بن ازہر کے بارے میں برقی کہتے ہیں کہ ان سے چار احادیث مروی ہیں جب کہ بقی انہیں دو احادیث روایت کرنے والوں میں شمار کرتے ہیں۔(۴۱)

حکم بن عمرو غفاری کو بقی ایک حدیث روایت کرنے والا اور برقی انہیں چار احادیث روایت کرنے والا بیان کرتے ہیں۔

برقی سعید بن عامر کو دو، سفیان بن وہب الخولانی اور شیبہ بن عجمان کو تین تین احادیث والا بیان کرتے ہیں مگر بقی انہیں ایک حدیث روایت کرنے والا شمار کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر بقی بن مخلد کی فہرست زیادہ جامع اور مکمل ہے اور اس سے صحابہ کرام کی زیادہ تعداد کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

بقی بن مخلد کی دیگر علمی خدمات: بقی بن مخلد کی تالیفات کا مفصل ذکر ہو چکا ہے، اس کے علاوہ ان کا یہ کارنامہ بھی ہے کہ انہوں نے اہل اندلس کو پہلی مرتبہ درج ذیل کتب سے روشناس کرایا:

۱- مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، ۲- امام شافعی کی مشہور کتاب ''کتاب الام''،

۳- خلیفہ بن خیاط کی ''کتاب التاریخ''، ۴- خلیفہ بن خیاط کی ''کتاب الطبقات''،

۵- دورقی کی ''سیرت عمر بن عبدالعزیز''۔

ابن الفرضی (۴۰۳ھ) لکھتے ہیں:

فھذہ المصنفات انفرد بقی بن مخلد بادخالھا الی الاندلس لاول مرۃ و لاشک انہ تحمل مصنفات اخری کثیرۃ بالسماع او الاجازۃ فی رحلتیہ الطویلتین و لم تسمھا المصادر فقد کان یری ان الاجازۃ کالسماع ۔(۴۲)	یہ تصنیفات پہلی مرتبہ بقی بن مخلد اندلس لے کر آئے اور اس امر میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے دونوں طویل علمی اسفار کے دوران بے شمار دیگر کتب کا سماعت کے ذریعے یا اجازت کے ذریعے علم حاصل کیا، اگرچہ مصادر اس حوالے سے خاموش ہیں، بقی بن مخلد اجازت کو سماعت کے مساوی سمجھتے تھے۔

بقی بن مخلد نے خلیفہ بن خیاط کی تاریخ میں کچھ اضافے بھی کیے اور ان کی پور زندگی تحصیل علم اور اشاعت علم کی تاب ناک داستان ہے

حواشی

(۱) For details see jouynball, Muslim Tradition, Cambridge University Press, 1985, pp 45-66 (۲) الذہبی، سیراعلام النبلاء، ۱۳/۲۸۵، موسسۃ الرسالۃ، بیروت الطبعۃ الحادیۃ عشرۃ، ۱۴۲۲ھ (۳) ابن الفرضی، تاریخ علماء الاندلس، ۲/۹۲، ۹۳، مطابع سجل العرب، القاہرہ ۱۹۶۶ء (۴) اکرم ضیاء العمری، بقی بن مخلد و مقدمۃ مسند ہ، ص ۳۶، بیروت ۱۹۸۴ء (۵) ابن الفرضی، تاریخ علماء الاندلس، ۲/۹۲، ۹۳، (۶) ابن الفرضی، سیراعلام النبلاء، ۱۳/۲۸۹ (۷) ابن الفرضی، تاریخ علماء الاندلس، ۲/۱۹۲ (۸) اکرم ضیاء

العمری، بقی بن مخلد و مقدمۃ مسند ہ، ۳۷ (۹) ابن الفرضی، سیر اعلام النبلاء، ۱۳/ ۲۹۳ (۱۰) ایضاً حوالہ بالا، ۲۹۴ (۱۱) اکرم ضیاء العمری، بقی بن مخلد و مقدمۃ مسند ہ، ۳۹ (۱۲) الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۲/۶۳۰، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد (۱۳) ابن الفرضی، تاریخ علماء الاندلس، ۲/ ۹۳ (۱۴) ابن الفرضی، سیر اعلام النبلاء، ۱۳/۲۸۹ (۱۵) الحمیدی، جذوۃ المقتبس، ۱۷۷، الدار المصریۃ للتالیف والترجمۃ، ۱۹۶۶ (۱۶) اکرم ضیاء العمری، بقی بن مخلد و مقدمۃ مسند ہ، ۵۹ (۱۷) اکرم ضیاء العمری، بقی بن مخلد و مقدمۃ مسند ہ، ۴۲-۴۵ (۱۸) یاقوت الحموی، معجم الادباء، ۴/ ۸۳ (۱۹) ابن الفرضی، تاریخ علماء الاندلس، ۲/ ۹۲ (۲۰) ایضاً حوالہ بالا (۲۱) الحمیدی، جذوۃ المقتبس، ۱/ ۲۷۵ (۲۲) ایضاً حوالہ بالا (۲۳) جذوۃ المقتبس، ۱/ ۲۷۵ (۲۴) ابن الفرضی، تاریخ علماء الاندلس، ۱/ ۹۲ (۲۵) ابن الجوزی، منتظم، ۵/۱۰۰ (۲۶) ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۱۱/۵۶، ۸۲ (۲۷) اکرم ضیاء العمری، بقی بن مخلد و مقدمۃ مسند ہ، ۴۹ (۲۸) ایضاً حوالہ بالا، ص ۲۷ (۲۹) ایضاً ص ۲۸ (۳۰) الذہبی، مقدمہ تجرید اسماء الصحابۃ (۳۱) اکرم ضیاء العمری، بقی بن مخلد و مقدمۃ مسند ہ، ۱۹ (۳۲) بخاری کتاب المغازی کعب بن مالک کی روایت میں آیا ہے: ''والمسلمون مع رسول اللہ ﷺ کثیر ولا یجمعھم کتاب حافظ ''دیوان کا لفظ امام زہری کا ہے (۳۳) اکرم ضیاء العمری، بقی بن مخلد ومقدمۃ مسند ہ، ۱۹ (۳۴) المقری، نفح الطیب، ۱/۵۸۱، ۲/۱۳۱، دار صادر بیروت ۱۹۶۸ء (۳۵) ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۱۱/۵۶-۵۷ (۳۶) الاشبیلی، فہرست ۱۳۹، ۱۴۰، موسسۃ الخانجی القاہرہ ۱۳۸۲ھ (۳۷) الحمیدی، جذوۃ المقتبس، ۱/۲۷۵ (۳۸) الکتانی، الرسالۃ المستطرفۃ، ۴۱، مطبع نور محمد کراچی (۳۹) الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۲/۵۷۰ (۴۰) ابن الجوزی، تلقیح فھوم اھل الاثر، ۳۶۶ (۴۱) ایضاً حوالہ بالا ۳۷۶ (۴۲) ابن الفرضی، تاریخ علماء الاندلس، ۱/۲۶۲-۲۶۴۔

☆☆☆☆

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا زمانۂ ورود ہند

(تاریخ کے آئینے میں)

از:- جناب محمد معتصم عباسی آزاد☆

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا شمار ہندوستان کے اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے، وہ ہندوستان میں سب سے مقبول ترین سلسلے "سلسلۂ چشتیہ" کے بانی تھے، انہوں نے اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر رشد و ہدایت کی شمع روشن کی اور اصلاح و تبلیغ کا آغاز کیا تھا، نوے سال سے زائد عمر میں وفات پائی، وہیں مدفون ہوئے، ان کا مزار آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے، ہر سال رجب کے مہینے میں ان کا عرس ہوتا ہے، جس میں برصغیر ہندو پاک سے لاکھوں کی تعداد میں زائرین اجمیر پہنچ کر درگاہ میں حاضری دیتے ہیں، اس موقعہ پر اردو رسائل و اخبارات میں ان کے مناقب و فضائل پر اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں، ان مضامین میں بعض ایسی روایتیں اور واقعات بھی بیان کئے جاتے ہیں جو تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتے بلکہ غلط اور گم راہ کن ہیں۔

دراصل صوفیہ کے بارے میں ہماری معلومات کا ماخذ وہ تذکرے ہیں جن کے لکھنے والے ذہنی طور پر خود بھی تصوف سے متاثر اور کسی نہ کسی سلسلہ تصوف سے وابستہ تھے، ان کا حسن اعتقاد صوفیہ سے منسوب کسی روایت یا واقعہ کی صحت و عدم صحت کو نقد اور اسناد کے اصولوں پر پرکھنے میں مانع ہوتا تھا، جو کچھ ان کے پیش رو بزرگوں نے لکھ دیا یا کسی عقیدت مند راوی سے سن لیا اسے بلانقد و تحقیق اپنے یہاں نقل کر دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے بیانات میں اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ کے بارے میں ان سے قریب العہد تذکرہ میر خرد کا "سیر الاولیا" ہے جو

☆ جی/۴۷ سفینہ اپارٹمنٹ، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ۔

چشتی مشائخ کے بارے میں مورخین اور تذکرہ نگاروں کے نزدیک سب سے زیادہ مستند ماخذ ہے کیوں کہ حضرت نظام اولیاؒ (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) سے میر خرد اور ان کے اہل خاندان کا تعلق حضرت فریدالدین گنج شکرؒ (۶۶۴/ ۱۲۶۵ء) کے زمانے سے چلا آرہا تھا اور ان کے درمیان کچھ خاندانی روابط تھے، خود میر خرد کی تربیت حضرت نظام الدین اولیاؒ کی نگرانی میں ہوئی تھی، لہذا چشتی سلسلے کے مشائخ کے حالات کے بارے میں ان سے زیادہ کسی کو واقفیت نہیں ہوسکتی تھی لیکن جن لوگوں نے "سیر الاولیا" کا مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ سیر الاولیا میں سنین کے اندراج میں سخت بے پروائی برتی گئی ہے، اکثر سنین غلط ہیں، وہ خواہ کاتب کی غلطی ہو یا خود میر خرد سے سہو ہوا ہو، اسی طرح بعض واقعات کے ذکر میں زبانی روایتوں پر انحصار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایسے واقعات بھی مذکور ہوگئے ہیں جن کا تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، ایسی ہی ایک روایت پرتھوی راج کے عہد میں حضرت خواجہ کی اجمیر میں آمد کے بارے میں ہے، جس نے عوام ہی کو نہیں بعد کے مورخین اور تذکرہ نگاروں کو بھی اب تک غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

"سیر الاولیا" کے بعد زیادہ تر تذکرے اور تاریخیں مغل عہد میں لکھی گئی ہیں، حضرت خواجہؒ کے بارے میں ان سب کا ماخذ سیر الاولیا ہی معلوم ہوتا ہے، ابوالفضل تک اس غلط روایت کو "آئین اکبری" میں نقل کرتا ہے۔(۱)

"در سال کہ معزالدین سام دہلی گرفت درانجا رسید"۔	جس سال معزالدین سام نے دہلی فتح کیا، وہاں پہنچے۔

بدایونی سلطان معزالدین محمد بن سام غوری (م ۶۰۳/ ۱۲۰۶ء) کے ہندوستان پر دوسرے حملے کے ضمن میں "منتخب التواریخ" میں لکھتے ہیں:(۲)

"وز جایہای دیگر چناں معلوم می شود کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز کہ سرچشمہ اولیای کبار و مشائخ نظام دیار ہنداست و مزار متبرک او در اجمیر	دوسری جگہوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز جو سرچشمہ اولیائے کبار اور دیار ہند کے نظام مشائخ ہیں اور جن کا مزار اجمیر میں

(۱) آئین اکبری، ج ۳، ص ۱۶۸۔ (۲) منتخب التواریخ، بدایونی، ج ۱، ص ۵۰۔

واقع دریں نوبت با سلطان ہمراہ بود"۔ واقع ہے، اس بار سلطان کے ہم راہ تھے۔

فرشتہ اور سیر العارفین کا بیان اس کے برخلاف ہے، دونوں سلطان قطب الدین ایبک (م ۶۰۷-۱۲۱۰) کے زمانے میں حضرت خواجہؒ کا ہندوستان آنا بتاتے ہیں (۱) لیکن جدید مورخین "سیر الاولیا" کے بیان کو درست تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چست" میں لکھتے ہیں (۲):

"حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان آئے اور اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر سلسلے کا کام شروع کیا"۔

حضرت خواجہ کے جس طرح ہندوستان میں آنے کے زمانے کے بارے میں اختلاف ہے، اسی طرح ان کے سن وفات میں بھی اختلاف ہے، سیر الاولیا میں حضرت خواجہ کا سن پیدائش درج نہیں ہے، صرف سن وفات ۶۳۳ھ دیا ہوا ہے، ابوالفضل نے ۶۳۳ھ سن وفات کے ساتھ سن پیدائش بھی ۵۳۷ھ دیا ہے، غلام سرور نے "خزینۃ الاصفیا" میں بھی یہی سن وفات درج کیا ہے۔ (۳)

"ولادت باسعادت آنجناب بہ اتفاق اہل تواریخ در سال پنج صد وسی و ہفت (۵۳۷) ووفات آں جامع الکمالات در روز دوشنبہ ششم ماہ رجب المرجب در سال شش صد وسی و سہ (۶۳۳) در عہد سلطان التمش وقوع آمد"۔

آنجناب کی ولادت باسعادت بہ اتفاق اہل تواریخ سال پانچ سو سینتیس اور وفات ان جامع الکمالات کی دوشنبہ کے روز ۶/ ماہ رجب المرجب چھ سو تینتیس میں سلطان التمش کے عہد میں واقع ہوئی۔

"اخبار الاخیار"، "سفینۃ الاولیا"، "گلزار ابرار"، "ثمار اجمیر" اور "تاریخ فرشتہ" وغیرہ میں بھی یہی سن پیدائش و وفات درج ہے (۴) لیکن "روضۃ الاقطاب" اور "مطلوب الطالبین" نے

(۱) تاریخ فرشتہ، فرشتہ، ج ۱، ص ۳۷۷، سیر العارفین، ص ۱۳-۱۲۔ (۲) تاریخ مشائخ چست، نظامی، ص ۱۳۳۔ (۳) خزینۃ الاصفیا، غلام سرور، ج ۱، ص ۲۶۵۔ (۴) اخبار الاخیار، ص ۲۲، سفینۃ الاولیا، ص ۱۲۸، گلزار ابرار (قلمی)، ثمار اجمیر، ص ۱۲۲، تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۷۷۔

اس سے اختلاف کیا ہے، مطلوب الطالبین کا بیان ہے: (۱)

"حضرت خواجہ معین الدین چشتی پیش از خواجہ قطب الدین وفات یافتہ نہ بعد از وی وفاتش (معین الدین چشتی) یکشنبہ ماہ رجب المرجب اثنی وثلاثین وستماۃ یعنی در سال شش صد وسی و دو (۶۳۲) واقع شد و وفات حضرت خواجہ (قطب الدین) پس از چند ماہ تاریخ چہاردہم ماہ ربیع الاول ثلث وثلاثین وستماۃ یعنی در سال شش صد وسی و سہ (۶۳۳) بود"

حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے حضرت قطب الدین سے پہلے وفات پائی تھی نہ کہ ان کے بعد، ان کی وفات یکشنبہ ماہ رجب المرجب ۶۳۲ھ میں ہوئی تھی جب کہ حضرت خواجہ (قطب الدین) کی وفات چند ماہ بعد ۱۴/ ربیع الاول ۶۳۳ھ میں ہوئی۔

"مرأۃ الاسرار" اور "معین الارواح" حضرت خواجہ کی وفات کے مذکورہ بالا دونوں سنین ۶۳۳ اور ۶۳۲ کی تردید کرتے ہوئے ان کا سن وفات ۶۲۷ بتاتے ہیں، مرأۃ الاسرار میں ہے کہ: (۲)

وفاتش روزشنبہ ماہ رجب در اثنی وثلاثین وستمایۃ (۶۳۲) چنانکہ از آفتاب ملک ہند پیدا می شود اما قول اول اصح، آزانکہ سلطان المشائخ و دیگر بزرگان ایں خاندان تصحیح نمودہ اند کہ خواجہ قطب الاسلام در ماہ ربیع الاول ثلث وثلاثین وستمایۃ (۶۳۳) وفات فرمودہ واز عبارت "دلیل العارفین" بہ لفظ خواجہ بزرگ کہ خواجہ قطب الاسلام نقل کردہ است چنانکہ نوشتہ است ،

اگرچہ ان کی (قطب الدین بختیار کا کی) وفات جیسا کہ "آنجناب ملک ہند" سے تاریخ نکلتی ہے، ۶/ ماہ رجب ۶۳۲ھ میں ہوئی لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ سلطان المشائخ اور اسی خاندان کے دیگر بزرگوں نے تصحیح کی ہے کہ ۶۳۳ھ ربیع الاول کے مہینے میں خواجہ قطب الاسلام نے وفات پائی تھی، "دلیل العارفین" کی عبارت میں خواجہ بزرگ کا لفظ جیسا کہ لکھا ہے خواجہ

(۱) مطلوب الطالبین (قلمی)۔ (۲) مرأۃ الاسرار، ص ۱۵۹، معین الارواح (قلمی)۔

پس ازیں بہ اختلاف برطرف گشت واز کلمات الصادقین بہ تحقیق پیوست کہ نقل خواجہ بزرگ در ششم ماہ رجب سبع و عشرین وستمایہ (۶۲۷) در زمان سلطان شمس الدین التمش انار اللہ برہانہ واقع شد وعمر شریفش نود وہفت رسیدہ بود اجمیر سکونت داشت ازاں جملہ مدت چہل سال وچند ماہ در اجمیر سکونت داشت''۔

قطب الاسلام کے لئے نقل کیا گیا ہے، یہاں سے اختلاف ختم ہوجاتا ہے اور ''کلمات الصادقین'' سے اس کی تحقیق ہوگئی کہ خواجہ بزرگ کی وفات ماہ رجب ۶۲۷ھ میں سلطان شمس الدین انار اللہ برہانہ کے زمانے میں ہوئی تھی، ان کی عمر شریف ستانوے سال کو پہنچ چکی تھی، اجمیر میں سکونت تھی، اس طرح اجمیر میں ان کا قیام چالیس سال کچھ ماہ رہا۔

حضرت خواجہ کی ہندوستان میں تشریف آوری کے زمانے اور سن وفات کے تعین میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف کے باوجود جن میں سے چند کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں سب ہی تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خواجہؒ کو شیخ عثمان ہرونیؒ سے خرقۂ خلافت باون سال کی عمر میں ملا تھا، ہندوستان آنے سے قبل وہ باون سال کی عمر تک نیشاپور کے قریہ ہرؔون میں اپنے مرشد کی خدمت میں رہے ان کے ساتھ مختلف دیار وامصار کا سفر بھی کیا تھا، باون سال کی عمر میں خرقہ خلافت ملنے کے بعد بھی وہ ایران وخراسان اور وسط ایشیا کی سیاحت کرتے رہے، چنانچہ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ انہوں نے سنجار، جبل، بغداد، ہمدان، تبریز، خرقان، استرآباد، ہری، سبزوار، حصار، بلخ، بخارا، اصفہان اور کرمان کا سفر کیا اور کئی بزرگوں کی صحبت میں رہ کر ان سے فیض حاصل کیا، آخر میں غزنین آئے، غزنین سے ملتان اور ملتان سے دہلی ہوتے ہوئے وہ اجمیر گئے تھے۔

کسی بھی مورخ یا تذکرہ نگار نے اس پر غور نہیں کیا کہ سلطان معزالدین بن سام غوری ۵۸۷ھ میں پرتھوی راج کو شکست دے کر اجمیر اور دہلی پر قابض ہوچکا تھا، اجمیر میں اس کی طرف سے سید حسین مشہدی جنگ سوار نامی داروغہ متعین تھا، اگر مورخوں اور تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ کا سن وفات ۶۳۲ھ یا ۶۳۳ھ مان لیا جائے تو وہ علی الترتیب ۵۹۱ھ یا ۵۹۲ھ میں باون سال کے ہوئے پھر ان کا پرتھوی راج کے عہد میں یا سلطان غوری کے ہم راہ ہندوستان آنا کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے، کیوں کہ سلطان غوری ۵۸۷ھ میں دہلی اور اجمیر فتح کرچکا تھا۔

اسی طرح اگر ''مرأۃ الاسرار'' کے دیے ہوئے سن وفات کو درست تسلیم کرلیا جائے یعنی ۶۲۷ھ تب بھی ان کا ۵۸۷ھ سے قبل ہندوستان آنا ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس حساب سے وہ ۵۸۵ھ ہی میں باون سال کے ہوئے اور ہندوستان آنے سے قبل اوپر بیان کیے گئے جتنے شہروں کی انہوں نے سیاحت کی تھی، اگر ان کی مسافت اور فاصلوں اور اس زمانے کے ذرائع اور طریقہ سفر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازہ کیا جائے تو کچھ نہیں تو کم از کم آٹھ دس سال کی مدت اس سیاحت میں لگی ہوگی، اگر اتنی مدت نہ بھی لگی ہو تب بھی دو سال کے عرصے میں یہ سیاحت پوری نہیں ہوسکتی تھی کہ ۵۸۷ھ سے قبل یا ۵۸۷ھ میں وہ ہندوستان پہنچ سکتے، لہذا مورخوں کا یہ بیان کہ حضرت خواجہ پرتھوی راج کے عہد میں یا سلطان محمد غوری کے ہم راہ ہندوستان آئے، تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر خرد یا ان کے راوی کو ''طبقات ناصری'' میں منہاج سراج کے اس بیان سے تسامح ہوا تھا۔(۱)

''سلطان غازی (معزالدین محمد بن سام غوری) دیگر سال لشکر اسلام جمع کرد وبہ انتقام سال گزشتہ روبہ ہندوستان نہاد ایں داعی از ثقہ ای شنید کہ از معارف تولک و جبال بود معین الدین لقب - اومی گفت کہ من دراں لشکر با سلطان غازی بودم''

سلطان غازی نے دوسرے سال لشکر اسلام جمع کیا اور گزشتہ سال کے انتقام کے لئے ہندوستان روانہ ہوا، اس دعا گو نے تولک و جبال کے ایک ثقہ معارف سے سنا جس کا لقب معین الدین تھا، وہ کہتا تھا کہ میں اس لشکر میں سلطان غازی کے ساتھ تھا۔

سلطان معزالدین محمد بن سام غوری اور پرتھوی راج کے مابین ہونے والی جنگ کی روداد منہاج سراج نے تولک اور جبال کے معین الدین لقب کے جس ثقہ راوی کے حوالے سے نقل کی تھی، اسے میر خرد یا ان کے راوی نے غلطی سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی سمجھ لیا اور ''سیر الاولیا'' میں اس جنگ میں ان کی شرکت کا ذکر کردیا، ان ہی سے دوسرے مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اپنے یہاں نقل کیا ہے اور یہ غلط روایت خواص وعوام میں شہرت پاگئی، بعض

(۱) طبقات ناصری، منہاج سراج، ج ۱، طبقہ ۱۹، ص ۴۰۰۔

تذکرہ نگاروں نے زیب داستاں کے طور پر اپنی طرف سے کچھ بڑھا بھی دیا ہے۔

اوپر حضرت خواجہ کے خرقہ خلافت پانے کی عمر اور تذکرہ نگاروں اور مورخوں کے بیان کردہ سن وفات کے تجزیہ سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ سلطان معز الدین محمد بن سام غوری کے فتح دہلی و اجمیر سے قبل یا سلطان کے ہم راہ حضرت خواجہ کا ہندوستان آنا ممکن نہیں ہوسکتا تھا، اس دعوے کے اثبات میں اور حضرت خواجہ کے ہندوستان آنے کے زمانے کے تعین کے لئے ایک معاصر شہادت پیش کرتے ہیں، جس کے بعد شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے، یہ شہادت حضرت خواجہ کے معاصر اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے قریبی ساتھی شیخ حمید الدین ناگوری (م ۶۷۳ / ۱۲۷۴) کی ہے، "سرور الصدور" جو ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس میں ان کا بیان ہے۔ (۱)

"نقل است کہ دراں وقت کہ شیخ نجیب الدین نخشی شیخ الاسلام بود او ہم از یاران شیخ معین الدین بودہ است ایشاں چہل یار در وقت سلطان شمس الدین التتمش می گویند کہ میاں دہلی آمدہ بودند سلطان شمس الدین می گویند کہ ہر یکی را جائزہ گراں داد، شیخ نجیب الدین نصیب خود را ہمہ ایثار کرد و دعوت ساخت و ہم در دہلی نماید سلطان شمس الدین او را پدر خواند و شیخ الاسلام دہلی خطاب داد و یاران دیگر ہر کسی بر طرفی رفتند، شیخ معین الدین در اجمیر فرود آمدید، چوں شیخ نجیب الدین شیخ الاسلام دہلی شدہ بود شیخ معین الدین ہم وقتی دیدن او بیامدی و شیخ بزرگ ہم در دہلی بماندی، تا می گویند کہ وقتی در مجلس دعوتی بود، این ہمہ بزرگان شیخ نجیب الدین، شیخ معین الدین و شیخ جلال الدین تبریزی و شیخ قطب الدین بختیار کاکی اوشی شیخ بزرگ نیز دراں مجلس بودند"

نقل ہے کہ جن دنوں شیخ نجیب الدین شیخ الاسلام دہلی تھے، وہ بھی شیخ معین الدین کے ساتھیوں میں تھے، یہ چالیس بار سلطان شمس الدین کے زمانے میں دہلی آئے تھے لوگوں کا بیان ہے کہ سلطان شمس الدین نے ان میں سے ہر ایک کو جائزہ گراں دیا، شیخ نجیب الدین نے اپنا سارا حصہ ایثار کردیا اور دعوت کی، وہ دہلی میں رک گئے، سلطان شمس الدین نے انہیں اپنا باپ بنالیا اور شیخ الاسلام دہلی کا خطاب دیا، باقی میں سے ہر ایک کسی طرف کو چلا گیا، شیخ معین الدین نے اجمیر میں سکونت اختیار کی جب شیخ نجیب الدین شیخ الاسلام دہلی تھے تو شیخ معین الدین ان سے ملنے ایک بار دہلی آئے تھے، شیخ بزرگ بھی دہلی میں رک گئے تھے، کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی مجلس میں دعوت تھی، یہ سب بزرگ شیخ نجیب الدین، شیخ معین الدین، شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ بزرگ اسی مجلس میں تھے۔

(۱) "سرور الصدور" (قلمی)، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ شہاب الدین سہروردی (۶۳۲ / ۱۲۳۴) کے مرید اور خلیفہ تھے، وہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے قریبی ساتھی تھے، کہا جاتا ہے کہ انہیں شیخ معین الدین چشتی یا حضرت بختیار کاکی کی طرف سے بھی خرقہ خلافت ملا تھا۔

سلطان شمس الدین التتمش ۶۰۷ / ۱۲۱۰ میں تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، حضرت خواجہ اس کے بعد ہی ہندوستان تشریف لائے ہوں گے، شیخ حمید الدین ناگوری کے بیان سے جہاں حضرت خواجہ کے ہندوستان آنے کے زمانے کا پتہ چلتا ہے وہاں تذکرہ نگاروں کے بعض بیانات کی تصدیق یا تردید بھی ہوتی ہے، اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت خواجہ اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے سن وفات میں تخلیط کا سبب "دلیل العارفین" میں شیخ بختیار کاکی کے لئے خواجہ بزرگ کے لقب کا استعمال تھا، شیخ حمید الدین ناگوری کے بیان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت بختیار کاکی کو خواجہ بزرگ کہا جاتا تھا، شیخ حمید الدین ناگوری کے بیان سے اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی دونوں ایک ساتھ ہندوستان میں آئے تھے، دونوں میں سے کوئی پہلے سے اجمیر اور دہلی میں موجود نہیں تھا، حضرت خواجہ دوبار دہلی آئے تھے، پہلی بار غزنین سے چالیس ساتھیوں کے ساتھ جن میں سے شیخ نجیب الدین اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی دہلی میں رہ گئے اور خود حضرت خواجہ نے اجمیر میں سکونت اختیار کی، دوسری بار شیخ نجیب الدین کے شیخ الاسلام دہلی ہونے کے بعد ان سے ملنے دہلی آئے تھے، دہلی کے اسی دوسرے سفر میں جب انہیں حضرت بختیار کاکی کی تکلیف اور پریشانیوں کا علم ہوا تو وہ انہیں اپنے ساتھ اجمیر لے جارہے تھے لیکن عوام کے احتجاج اور سلطان کی مداخلت سے انہیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا، اس انکشاف کے بعد کہ وہ سلطان شمس الدین التتمش کے عہد میں ہندوستان آئے تھے، ہندوستان میں ان کی مدت حیات جو تذکرہ نگاروں

نے بیان کیا ہے اس کی اور کئی اور باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت خواجہ کا پرتھوی راج کے عہد میں یا معزالدین محمد سام غوری کے ہم راہ ہندوستان آنا جیسا کہ تذکرہ نگاروں کے بیان کردہ سن وفات اور خرقۂ خلافت ملنے کی عمر کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے ممکن نہیں تھا اور تاریخی اعتبار سے یہ بیان غلط ہے (۱)، اس کی تردید ایک معاصر شہادت سے بھی ہوتی ہے، دوسرے ۶۳۳ھ حضرت خواجہ کا سن وفات نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس سن میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی وفات ہوئی تھی اور یہی سلطان شمس الدین التتمش کا بھی سن وفات تھا، ربیع الاول کے مہینے میں حضرت بختیار کاکی اور شعبان کے مہینے میں سلطان التتمش نے وفات پائی تھی، اگر اسی سن میں حضرت خواجہ نے بھی رحلت کی ہوتی تو ایک ہی سال میں چند ماہ کے وقفے سے تین بڑی شخصیتوں کا اٹھ جانا اس زمانے کی تاریخ کا غیر معمولی واقعہ ہوتا اور کسی نہ کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کا ذکر ضرور آتا، ''کلمات الصادقین'' کے حوالے سے ''مرأۃ الاسرار'' کا دیا ہوا سن وفات ۶۲۷ھ زیادہ قرین قیاس ہے۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کی طرف اشارہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، حضرت خواجہ شاعر تھے یا نہیں، انہوں نے کوئی مجموعہ کلام چھوڑا تھا یا نہیں، اس کا تو بغیر ثبوت و شہادت کے مشکل ہے لیکن جو دیوان ان سے منسوب کیا جاتا ہے اس میں بیشتر غزلیں ملا معین الدین مسکین ہروی کی اور کچھ دوسرے شاعروں کی شامل ہیں، جو ان کے مطبوعہ دیوانوں میں موجود ہیں، ملا معین الدین مسکین غالی شیعہ تھے، ایک عرصہ دکن میں رہنے کے بعد ایران چلے گئے تھے، ''معارج النبوۃ'' اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، ''حقا کہ بنا کے لا الہ است حسینؓ'' والا قطعہ بھی ان ہی کا ہے، جو حضرت خواجہ سے منسوب ہو کر شہرت پا گیا۔ (۲)

(۱) جہاں تک مجھے علم ہے سب سے پہلے مولانا صباح الدین عبدالرحمان مرحوم نے کھل کر تو نہیں پردے پردے میں مورخوں اور تذکرہ نگاروں کے اس بیان پر شک وشبہ کا اظہار کیا تھا، ''بزم صوفیہ''، ص ۵۷-۵۸۔ (۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''مقالات شیرانی'' پروفیسر محمود شیرانی اور ''کارنامۂ نذیر'' مرتبہ ریحانہ خاتون۔

☆☆☆

اسلامی مدارس کے نصاب کا مسئلہ

علامہ شبلی نعمانی کے حوالے سے

از:- جناب ریاض الرحمان خاں شروانی ☆

مدارس اسلامیہ کے قیام کا اصلی مقصد مسلمان بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنا ہے اور دین کی بنیاد قرآن مجید پر ہے، اس لئے ان مدارس کی تعلیم کا محور قرآن مجید ہے اور اگر نہیں ہے تو ہونا چاہیے، قرآن مجید بہت سے علوم و فنون کا منبع بھی ہے، صرف ان علوم کا نہیں جنہیں عام طور سے دینی علوم کہا جاتا ہے بلکہ ان علوم کا بھی جو دنیوی علوم سمجھے اور مانے جاتے ہیں، میرے ایک طالب علم نے کشمیر یونی ورسٹی میں اس موضوع پر تحقیق کر کے ایم-فل اور پی ایچ-ڈی کی ڈگریاں حاصل کی تھیں کہ عربی میں عہد عباسی تک دینی اور سماجی علوم کے آغاز و ارتقا پر قرآن مجید کے کیا اثرات مترتب ہوئے، قرآن کی فہم اور اس کے احکام پر عمل حدیث سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے، قرآن مجید کی سب سے جامع اور عملی تفسیر نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور حدیث مجموعہ ہے آپ ﷺ کے اقوال و افعال کا، قرآن مجید اور حدیث شریف کی روشنی میں استنباط مسائل کا علم فقہ کہلاتا ہے، اس طرح حدیث اور فقہ کا قرآن مجید سے براہ راست تعلق معلوم و معروف ہے اور اس سے بھی ہم سب واقف ہیں اور یہ ہم سب کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید مکمل ضابطۂ حیات ہے، مکمل ضابطۂ حیات میں قانون، سیاسیات، معاشیات سب کچھ آجاتا ہے، اس لئے قرآن مجید میں ان سب کے مبادیات موجود ہیں لیکن قرآن مجید قانون، سیاسیات یا معاشیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ کتاب ہدایت ہے جس کا مقصد تہذیب اخلاق اور انسان کو بہتر انسان بنانا ہے، یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ بہتر انسان بنانے کا مقصود کیا ہے؟ زندگی اس

☆ حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ۔

طرح گزارنا جس سے عاقبت سنور جائے، میرے نزدیک یہ نکتہ اس لئے پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ دنیا کا ہر مذہب اور ہر فلسفہ حیات یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ انسان کو بہتر انسان بنانا چاہتا ہے، مثلاً بدھ مت میں خدا کا تصور نہیں ہے لیکن انسان کی فلاح و بہبود کا دعوے دار وہ بھی ہے، اس لئے جب ہم اس کا تعلق عاقبت سے جوڑ دیتے ہیں تو یہ اسلام کی بنیادی خصوصیت بن جاتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تاریخی واقعات جگہ جگہ بیان فرمائے ہیں، تاکہ انسان ان سے سبق حاصل کرے، ان افعال و اعمال سے پرہیز کرے جو قوموں کی تباہی و بربادی کا موجب ہوئے اور اس راستے پر چلے جس پر چل کر افراد و ملل نے صلاح و فلاح حاصل کی اور اسی لئے ہم شب و روز میں کتنی مرتبہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلائے جو اپنے اعمال حسنہ کی بدولت اس کے انعام کے مستحق پائے اور ان لوگوں کی راہ سے دور رکھے جن کے اعمال قبیحہ نے انہیں اس کے غیظ و غضب کا مستوجب بنایا، معاشیات و سیاسیات کا سبق بھی ہمیں اسی غرض سے پڑھایا گیا ہے کہ ہم ان کے قرآنی اصول و مبادی پر عمل پیرا ہو کر راست روی اختیار کریں اور گم راہی سے بچیں، قرآن مجید میں مختلف علاقوں اور ملکوں کے محل وقوع اور جغرافیائی کیفیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور پھر ہمارے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جس سرزمین کو مہبط وحی بننے کا شرف حاصل ہوا اس کا ماحول، اس کی آب و ہوا اور اس کے حدود اربعہ کیا تھے، اسی لئے تو مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن تصنیف فرمائی ہے۔

قرآن مجید میں تعقل، تفکر اور تدبر پر جتنا زور دیا گیا ہے اس کا قدرتی نتیجہ مسلمانوں میں علوم عقلیہ کا فروغ تھا، چنانچہ منطق، فلسفہ اور تصوف کو مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کا حصہ بنایا گیا، اسی طرح قرآن مجید میں سورج، چاند اور ستاروں کی گردش کا احوال ہے، ایک طرف ان سے قدرت الٰہی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف تعیین اوقات میں مدد ملتی ہے، اس نے مسلمانوں کی توجہ فلکیات اور ریاضی کی طرف منعطف کی اور یہ علوم بھی مدارس کے نصاب میں داخل ہوئے، العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان (علم کی دو قسمیں ہیں: دین کا علم اور حیوانی اجسام کا علم) کا مطلب بھی یہی ہے کہ علم سے مراد صرف دینی علم نہیں ہے بلکہ دنیوی علوم بھی اس کا جز ہیں، کیا Anatomy کا ماخذ ہم اسے قرار نہیں دے سکتے؟

جہاں قرآن مجید کا اعجاز اس کے معانی و مطالب ہیں وہاں اس کا اسلوب بھی ہے، قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے اور اس کے لئے عربی زبان کا وہ اسلوب منتخب کیا گیا جو صاحب وحی (ﷺ) کے قبیلے کا اسلوب تھا اور جسے اس وقت بھی عربی زبان کا بہترین اسلوب تسلیم کیا جاتا تھا، اس لئے عربی ادب و شاعری کا ذوق مسلمانوں میں پیدا ہونا لازمی تھا اور شاعری کا ذوق تو عربوں کا آبائی ورثہ بھی تھا، جب غیر عرب اسلام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تو ان کے لئے عربی میں مہارت حاصل کرنا ناگزیر ہوگیا کیوں کہ اس کے بغیر نہ وہ تعلیمات اسلامی سے واقف ہو سکتے تھے اور نہ ان پر عمل کر سکتے تھے اور نہ ہی ملکی و انتظامی معاملات میں اپنا حصہ بٹا سکتے تھے، دنیا کی شاید ہی کسی اور زبان کی یہ خصوصیت ہو جو عربی کی ہے کہ اس کی گریمر سے واقف ہوئے بغیر اسے پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہیں ہے، اس لئے اس زبان میں گریمر یعنی صرف و نحو کو اساسی اہمیت حاصل ہے، تاہم ہمارے علم کی حد تک ہندوستان میں ندوۃ العلما کی تحریک کے آغاز سے قبل غیر ضروری طور پر بہت زیادہ وقت صرف و نحو پر صرف کیا جاتا تھا اور عربی ادو وانشا کو نصاب میں اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی جتنی ہونی چاہیے تھی۔

یہ سب علوم و فنون جن کا منبع ہمارے نزدیک قرآن مجید ہے، ان ہی کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ چند سال کی محدود مدت میں طالب علموں میں ان سب کی مہارت پیدا کرنا تو علاحدہ رہا، انہیں ان سب سے واقف ہی کرنا امر دشوار ہے، اس مسئلے پر اس خطبے کے آخر میں کسی قدر اظہار خیال کیا جائے گا۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں جب ہندوستان اور دیگر ایشیائی و افریقی ممالک یورپین ملکوں کے زیر نگیں آئے تو وہاں کی زبانوں سے واقفیت اور ان کے ساتھ آئے ہوئے بعض جدید علوم و فنون سے آگاہی بھی ضروری ہوگئی اور یہ سلسلہ حصول آزادی کے باوجود آج تک جاری ہے، ظاہر ہے کہ ان سب کی سمائی مدارس اسلامیہ کے نصاب میں ممکن نہیں تھی، اس لئے جدید طرز کی درس گاہوں کی تاسیس لازمی ہوگئی، یہاں میں تھوڑی دیر کے لئے اس خطبے کے اصل موضوع سے کسی قدر انحراف کر کے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علوم کی قدیم و جدید میں یہ تقسیم حالات کا لازمی تقاضہ تھی اور اس سے مفر نہیں تھا، دوسری بات یہ ہے کہ میں اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں ہوں کہ ہماری قدیم تعلیم

کا تعلق معاد سے ہے اور جدید تعلیم معاش سے سروکار رکھتی ہے، یہ دونوں مفروضے میری رائے میں
بس ایک حد تک ہی قابل قبول ہیں، یوروپین ممالک کے ایشیائی اور افریقی ممالک پر تسلط سے پہلے ان
دونوں براعظموں میں جو تعلیم رائج تھی اس کے فارغین ہی دینوی امور بھی انجام دیتے تھے، وہ اپنے
اپنے ڈھنگ سے کاروبار حکومت چلاتے تھے، فوج کی سربراہی بھی کرتے تھے، عدل وانصاف کے
تقاضے بھی پورے کرتے تھے، تجارت، صنعت وحرفت سے متعلق امور سے بھی عہدہ برآ ہوتے تھے
اور بیرونی ممالک سے سفارتی تعلقات بھی استوار کرتے تھے۔

اسی طرح آج کے جدید تعلیم یافتہ افراد کے بارے میں یہ سوچنا کسی لحاظ سے مناسب نہیں
ہے کہ وہ معاد کی طرف سے لازمی طور پر بے پرواہ رہتے ہیں، اس کے برعکس متعدد ایسی جماعتیں
اور تنظیمیں جن کا سروکار امور مذہبی سے ہے وہ بیشتر اپنے پیرو اور کارکن جدید تعلیم کی درس گاہوں سے
حاصل کرتے ہیں بلکہ میں نے کسی بڑے عالم دین کا یہ قول پڑھا تھا کہ آج قدیم طرز کی درس گاہوں
کے مقابلے میں ہماری امیدیں جدید طرز کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں سے
زیادہ وابستہ ہیں، ان کے جوابات تلاش کرنے سے پہلے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس پر غور کرلیا
جائے کہ اس معاملے میں ہمیں علامہ شبلی نعمانی سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔

علامہ شبلی کی عظمت کا مینارا اتنا بلند ہے کہ ان کے بیشتر مداحین ومعتقدین اس مینار کی ایک یا
چند منزلوں تک پہنچ کر ہی رک جاتے ہیں، اس کی چوٹی تک پہنچنے کی ہمت بہت کم لوگ کرسکتے ہیں،
راقم الحروف بھی اپنے کو ان کے مداحوں میں شمار کرتا ہے لیکن اس کا یہ دعوی ہرگز نہیں ہے کہ وہ ان کی
عظمت کے مینار کی چند منزلوں تک بھی رسائی حاصل کرسکا ہے، اس کے لئے ان کی شخصیت کا سب
سے دل کش اور جاذب توجہ پہلو ان کی بلند نظری اور روشن خیالی ہے، ان کی یہ بلند نظری اور روشن خیالی
مذہب، سیاست، علم وادب سب شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں ہوئی ہے، اس بات کو ان کے معتقد
خصوصی مولانا ابوالکلام آزاد نے اس طرح کہا ہے "ہر میدان میں اپنے ذوق وفکر کی ایک خاص اور بلند
جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طالب علم کی ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں
پڑی تھی، خشکی طبع جو اس راہ کے مہالک وآفات میں سے ہے، انہیں چھوکر بھی نہیں گئی تھی" (۱)،
علامہ شبلی کا یہ نقش کتنا دل افروز ہے اور یہی وہ نقش ہے جو انہیں اپنے بیشتر معاصرین ہی سے نہیں

متعدد اخلاف سے بھی ممتاز کردیتا ہے اور ان کے اسی نقش جمیل کا قتیل راقم الحروف بھی ہے، آیئے
دیکھیں موضوع زیر بحث میں ان کی بلند نظری اور روشن خیالی سے ہم کیا فیض حاصل کرسکتے ہیں۔

راقم الحروف نے آج سے دس برس قبل اسی ہال میں کھڑے ہوکر علامہ شبلی کی شخصیت کے
امتیازی پہلوؤں پر جو معروضات پیش کی تھیں، ان میں بالخصوص علامہ کی ایم-اے-او کالج علی گڑھ
اور ندوۃ العلما لکھنؤ میں مساعی کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی، ندوۃ العلما میں علامہ کا زیادہ تر سروکار
نصاب کی اصلاح وتبدیلی سے رہا تھا اور اس میں بالخصوص انگریزی کی تعلیم کو شامل کرنے پر انہیں
اصرار تھا، آخر وہ اس کے نصاب میں انگریزی کو شامل کرنے پر اس قدر مُصر کیوں تھے؟ کیا صرف اس
لئے کہ اس سے ندوۃ العلما کے فارغین کو حصول معاش میں آسانی ہوجائے گی، ہمارے خیال سے
نہیں، تاہم آج بیشتر دینی مدارس سے فراغت حاصل کرکے طلبہ حصول معاش ہی کی خاطر یونی ورسٹیوں
کا رخ کرتے ہیں، اس کے برعکس ان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ انگریزی پڑھ کر ایک طرف ان کی
رسائی دیگر جدید علوم تک ہوجائے گی، علی گڑھ میں رہ کر وہ اس کا تجربہ خود کرچکے تھے، سرسید احمد خاں
اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبت اور ان کے ذریعہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے مطالعے نے انہیں
بہت فائدہ پہنچایا تھا، ان کے قلب کو آسودہ اور ان کے دماغ کو روشن کیا تھا، دوسرے وہ جانتے تھے
کہ وہ نوجوان جو ایک طرف دینی علوم سے آراستہ ہوں گے اور دوسری طرف انگریزی اور اس کے
ذریعہ جدید علوم سے واقف ہوں گے وہ اسلام کی خدمت ان لوگوں سے بہتر طور پر انجام دے سکیں
گے جن کا علم صرف کسی ایک دائرے میں محدود ہوگا، تیسری طرف تحقیق کے جدید اصول اور جدید
ٹیکنیک سے کام لے کر ہی ان محققین اور دانش وروں کے بے جا اعتراضات کا رد ممکن ہے جو اسلام
اور مسلمانوں کی نکتہ چینی کو اپنا شعار بناتے ہیں، یہاں میں یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مستشرقین
کے بارے میں خود میرا رویہ اتنا منفی نہیں ہے جتنا ہمارے علمائے کرام کا ہے، میرے نزدیک انہیں
دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ جنہوں نے ہمارے پوشیدہ یا گم گشتہ علمی خزانوں کی
بازیافت کرکے ہم پر بڑا احسان کیا ہے اور دوسرے وہ جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، تاہم یہ سمجھنا
درست نہیں ہوگا کہ علامہ شبلی ندوۃ العلما اور دوسرے دینی مدارس کے نصاب میں بس انگریزی کی
شمولیت پر اکتفا کرتے تھے، اس کے برعکس ان کا سروکار اس سے کہیں زیادہ وسیع اور دوررس تھا،

میں دفاتر کھول دیئے ہیں اور تین سو کے قریب مسلم تنظیموں سے اس کے روابط ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام اور مسلم نوجوانوں کی اصلاح و تربیت خاص طور پر اس کے پیش نظر ہے۔

ابھی حال ہی میں انقرہ ترکی میں "القدس ۲۰۱۵ء" "آرکیٹکچرل ہیریٹج" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا، اس کا افتتاح فلسطین کے سفیر اور ارسکا کے ڈائرکٹر نے کیا، سیمینار میں باری یونی ورسٹی کے شعبہ آثار قدیمہ کے پروفیسر اور طلبا کے ذریعہ کیے گئے آثار قدیمہ کے تحقیقاتی نتائج بھی زیر بحث آئے، ارسکا نے فلسطین کے آثار قدیمہ کے تحفظ کے لئے جو کوششیں کی تھی سیمنار اس کی قدر و قیمت کے تعین اور کامیابوں کے جائزے کے لئے کیا گیا تھا۔

رسالہ "سائنس" کی اطلاع ہے کہ امریکی سائنس دانوں نے ۶۰ر واٹ کے بلب کو ۶۰ر فٹ کی دوری پر بغیر کسی تار کے جلانے کا کامیاب تجربہ کیا ہے، اس تھیوری پر کام کا آغاز اس سے قبل ۲۰۰۶ء میں میسیا چوسٹیس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے محققین نے کیا تھا، سائنس کی اس لاسلکی (یعنی غیر مرئی رابطہ) ترقی کے سبب اب برقی تار سے آزادی ملنے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

سوئیڈن یونی ورسٹی کے سائنس دانوں نے ایک ایسا ڈیجیٹل کاغذ ایجاد کیا ہے جسے چھونے ہی سے وہ اپنے اندر تحریر کردہ خبروں سے مطلع کردے گا، اس کاغذ میں کنڈکٹو لنکس کا استعمال ہوا ہے جو دباؤ کے اثر ہی سے اپنے اس مائیکرو کمپیوٹر کو اطلاع دیتے ہیں جس میں ریکارڈ شدہ پیغام موجود ہوتا ہے پھر کاغذ پر لگے ہوئے انتہائی حساس اسپیکرز کی مدد سے خبریں بہ آسانی نشر ہونا شروع ہوجاتی ہیں، سائنس دانوں نے اس پروجیکٹ کا نام "فائبر سائنس اینڈ کمیونیکیشن نٹ ورک" رکھا ہے، بولتے ہوئے کاغذ کی اس نئی ٹیکنک سے ممکن ہے آیندہ ایجادات و مصنوعات اور اشتہار کا کام لیا جائے، خصوصاً سگریٹ وغیرہ کی پیکنگ میں، اسے پینے والوں کو تحریری ہی نہیں صوتی انتباہ ہوجائے کہ سگریٹ کا استعمال صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔

"ڈیلی میل" کے آن لائن پر یہ خبر موجود ہے کہ کیلی فورنیا کی ایک دوا ساز کمپنی "اوریکس جین" نے وزن کم کرنے والا ایک ایسا ٹیبلٹ تیار کیا ہے جو اب تک کی موجود دواؤں سے زیادہ کارگر اور موثر ہے، اس کی یہ خوبی بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا استعمال دل کی بیماری، شوگر اور کینسر وغیرہ کے خطرات سے بھی بہت حد تک مامون کردے گا، مزے کی بات یہ ہے کہ یہ مرد و زن کے لئے

یکساں کارگر ہے، نیز کمپنی نے یہ دعوا کیا ہے کہ اس کے استعمال سے مریض پر مثبت اثر پڑتا ہے۔

ماہرین کو آلو سے پلاسٹک بنانے میں کامیابی ملی ہے، آلو میں پہلی بار اس قسم کے اجزا معلوم کئے گئے ہیں، اس سے پہلے مکئی وغیرہ سے پلاسٹک تیار کی جاچکی ہے، اس ٹیکنک کو مینس مانگریٹ چیز اسمتھ پالیسی سنٹر میں ترقی دی گئی ہے، رپورٹ کے مطابق اس نئی دریافت سے آلو کی پیداوار اور تجارت بڑھے گی اور کھاد کے علاوہ اس سے پلاسٹک بھی تیار کی جاسکے گی، جاپان اور برطانیہ نے آلو سے بعض چیزیں بنائی بھی ہیں، اس سے بنی ہوئی پلاسٹک میں موجودہ پلاسٹک کے مقابلے میں آلودگی کے عناصر کم ہوتے ہیں۔

"عہد عثمانی میں طبیعی اور عملی سائنس پر مشتمل لٹریچر کی تاریخ" کے موضوع پر ارسکا نے ۲۰۰۶ء میں ایک کتاب شائع کی ہے، جو دراصل "ہسٹری آف آٹومن لٹریچر آف سائنس سیریز" کا ایک حصہ ہے، جس میں اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں، رسالوں، مضامین، روداووں اور قانونی دستاویزات کے بارے میں مکمل معلومات کا ذخیرہ ہے گویا عہد عثمانی (۱۲۹۹-۱۹۲۳ء) کے دوران اس کے دائرہ حکومت میں عملی اور طبیعی سائنس کے میدانوں میں انجام پانے والے تمام کارہائے نمایاں کا حسین مرقع ہے، فزکس، کیمسٹری، موسمیات، علم نباتات، علم الحیوان، علم الارض، انجینیرنگ، علم الزراعت، جنگلات، تعمیرات اور قیمتی پتھروں سے متعلق امور کو بہ طور خاص موضوع بنایا گیا ہے، کتاب کا قابل ذکر حصہ عربی اور فارسی کی ان اور یجنل کتابوں کے ترکی زبان میں ترجمہ پر مشتمل ہے جو اکثر عہد اسلامی کی ابتدائی صدیوں میں تصنیف کی گئیں تھیں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی انگریزی، فرنچ، جرمن، اٹالین تصنیفات کے ترجمے بھی ہیں، یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ان ہی دو صدیوں میں یوروپین طرز کے تعلیمی اداروں کو ترقی ملی اور جدید سائنس کو پڑھانے کا رواج بھی اسی زمانہ میں ہوا اور بعض اہم یوروپین تصنیفات ترکی اور عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں، اس سیریز کے تحت اب تک علم الافلاک، علم الحساب، جغرافیہ، موسیقی، ملیٹری آرٹ اور سائنس کے موضوع پر کتابیں شائع کی جاچکی ہیں، آیندہ اسی سیریز کے تحت دواؤں کے خصائص، علاج معالجے اور دواسازی کے موضوع پر عہد عثمانی کا سائنسی لٹریچر فراہم کیا جائے گا۔

ک۔ص اصلاحی

علامہ شبلی نے الاقدم کا درجہ دیا ہے، اختیاری مضامین کا اضافہ تعلیم کے درمیانی مرحلے میں کیا جاسکتا ہے اور آخری مرحلے کو تخصص کے لئے مخصوص کردیا جائے یعنی اس مرحلے پر طالب علم اپنے ذوق کے مطابق دینی علوم (یعنی قرآن، حدیث یا فقہ) یا پھر عربی ادب وانشا میں دست رس حاصل کرے۔

جو اسکیم اوپر پیش کی گئی وہ محض ایک خاکہ ہے، اس میں رنگ مدارس اسلامیہ کے ماہرین تعلیم ہی بھر سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں مناسب اسٹاف کی فراہمی ایک بڑا مرحلہ ہوگا اور اس پر خرچ بھی بہت آئے گا لیکن ادھر بعض وجوہ سے ماشاء اللہ

اکثر دینی درس گاہوں کی مالی حالت بہت بہتر ہوتی ہے، جس پر شاہد ان کی شان دار عمارتیں ہیں، ہمارے یہاں قدیم اور جدید دونوں طرز کی درس گاہوں میں جتنی اہمیت عمارتوں اور ان کے ساز وسامان کو دی جاتی ہے، وہ ہمارے نزدیک ترجیحات کے غلط تصور کا نتیجہ ہے، جدید درس گاہوں کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ مادیت کا شکار ہیں لیکن جہاں روحانیت کا دور دورہ ہے وہاں تو ترجیحات کے تصور میں کسی قدر تبدیلی کرکے آمدنی کا بڑا حصہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے اور اس کے لئے ذرائع واشخاص فراہم کرنے میں صرف کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔

اصلی بات مسئلے کی اہمیت کو سمجھنا اور اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہونا ہے، اگر یہ آمادگی پیدا ہوجائے تو راہ کی دشواریاں خواہ وہ کسی نوعیت کی ہوں، دور ہو ہی جاتی ہیں اور ہمارے اسلاف تو دشواریوں کو کبھی خاطر میں لاتے ہی نہیں، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے اپنی معروف ومقبول تصانیف علمائے سلف اور نابینا علماء میں بہت حسن وخوبی سے بتایا ہے کہ حصول علم کی راہ میں حائل دشواریوں پر ہمارے اسلاف کرام نے کس طرح قابو پایا تھا، ظاہر ہے کہ دشواریوں کی نوعیت بدل گئی ہے، اس لئے ان پر قابو پانے کے لئے نئے عزم وحوصلے کے ساتھ نئی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی اور ان کی نشان دہی علامہ شبلی نعمانی پہلے ہی کرچکے ہیں۔

حواشی

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی: کاروان خیال، مدینہ پریس بجنور، ۱۹۴۷، ۹۳۔

(۲) علامہ شبلی نعمانی: مقالات شبلی، جلد ۳، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۵، ۱۲۹۔

(۳) ایضاً: ۱۳۳۔

اخبار علمیہ

اخوان النظری محمد عمران نامی ملیشیا کے ایک طالب علم نے بائبل کے ورژن کے طرز پر ایک سافٹ ویر "پلے اسٹیشن قرآن" نام سے تیار کیا ہے، اس میں بچوں کے لئے تفریح اور عبادت (یعنی تلاوت قرآن) شامل ہے، اس ورژن کو بہ آسانی اپنے کمپیوٹر پر لوڈ کرنا ہم خرما وہم ثواب کے مصداق ہے، اس کا کہنا ہے کہ بائبل کی طرح قرآن مجید کا بھی اس قسم کا ورژن تیار ہوسکتا ہے جو نوجوان فضول اور لایعنی پروگرام اور انٹرنیٹ اور گیم کھیلنے میں اپنے قیمتی اوقات ضائع کرتے ہیں، یہ طریقہ قرآن مجید سے ان کی دل چسپی اور رغبت بڑھانے میں موثر ہوسکتا ہے، عرصے سے پوری دنیا کے مسلم گیمرز اس قسم کے ورژن تیار کرنے متفکر تھے۔

۲۳ رستمبر ۲۰۰۷ء کو یو، کے میں الہامی (آسمانی) کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا جائے گا اور اس میں اسلام، عیسائیت اور یہودیت تینوں بڑے مذاہب کے ماننے والے اکٹھا ہوں گے، برٹش لائبریری نمائش میں تینوں مذاہب کی الہامی کتابوں کے متون مختلف اداروں اور لائبریریوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تاکہ نمائش بہت شان دار اور بے مثال ہو، قرآن مجید کے تین نادر نسخے رباط کی رائل لائبریری مریکو سے لائے گئے ہیں، نیز خانہ کعبہ سے وہ قرآن جس کو "کسوہ" کہا جاتا ہے اور سلطان بیبرس کا قرآن بھی اس کے لئے منگایا گیا ہے۔

مکہ کی ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ کے معاون جنرل سکریٹری نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ WAMY نے ام القری یونی ورسٹی مکہ میں بیرونی طلبہ کے لئے ایک کیمپ یا ورک شاپ لگانے کا پروگرام بنایا ہے، ان کے بہ قول WAMY کا یہ پروگرام اس لحاظ سے اہم ہوگا کہ اس میں طلبہ کو اپنی سیرت وشخصیت کو اس طرح ڈھالنے کا گر سکھایا جائے گا کہ وہ اشاعت اسلام کے کام میں قائدانہ رول ادا کرسکیں، WAMY نے پوری دنیا کے مسلم نوجوانوں کی خدمت اور مدد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جس کے تھوڑے ہی عرصے میں اس نے چالیس سے زیادہ ملکوں

انہوں نے جہاں قدیم اور جدید دونوں طرز تعلیم کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا ہے وہاں ان کے نقائص کی بھی نشان دہی کی ہے، چوں کہ اس وقت ہمارا موضوع جدید تعلیم کی درس گاہیں نہیں ہیں بلکہ قدیم تعلیم کے مدارس اور دار العلوم ہیں، اس لئے اظہار خیال ان ہی تک محدود رکھیں گے، اس بارے میں علامہ شبلی کو احساس تھا کہ ''یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافے کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علما تک اس ضرورت کے قائل نہیں'' (۲)، آج صورت حال شاید اتنی مایوس کن تو نہیں ہے جتنی علامہ شبلی کے زمانے میں تھی لیکن ابھی تک ہمارے بیشتر علمائے کرام اس معاملے میں وہاں تک بھی نہیں پہنچے ہیں جہاں بیسویں صدی کے آغاز میں علامہ شبلی کھڑے تھے، حال آں کہ ایک صدی کی گردش کے دوران اور اس گردش کی بہ دولت علوم وفنون میں نوع بہ نوع اضافوں کے پیش نظر ہمیں اس سے کہیں آگے تک پہنچ جانا چاہیے تھا، علامہ شبلی نے علی گڑھ اور ندوۃ العلما دونوں سے مایوس ہو کر دار المصنفین کی تاسیس فرمائی تھی، اس لئے یہ آواز سب سے زیادہ زوردار طریقے سے یہیں سے بلند ہونی چاہیے کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ادارہ اپنے وجود کا جواز اپنے کو اپنے بانی کی فکر اور نصب العین سے قریب رکھ کر ہی مہیا کر سکتا ہے، دار المصنفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا اس موضوع پر جو مضمون مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ کے حالیہ شمارے میں شائع ہوا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ شاید دار المصنفین کے کارکنوں کو اس ضرورت کا احساس ہے، راقم الحروف بھی علامہ شبلی کے ایک معتقد اور دار المصنفین کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے اس آواز میں اپنی آواز ملانا چاہتا ہے۔

راقم الحروف نے اس خطبے کے شروع میں مدارس کے نصاب کے بارے میں اپنی جو ترجیحات گوش گزار کی ہیں وہ علامہ شبلی کی اس رائے سے مختلف نہیں ہیں ''متعدد علوم وفنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضرور ہے یعنی کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں ان کو حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے، جو مقصود بالعرض ہیں ان میں کم، اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بہ لحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہیے یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں'' (۳)، اس ہدایت کی روشنی میں ظاہر ہے کہ اولیت قرآن مجید کی تعلیم کو حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے بعد حدیث شریف کی تعلیم کو، ان دونوں کے بعد فقہ کا درجہ آتا ہے،

ادب وشاعری اور انشا اس لئے خاص توجہ کے مستحق ہیں کہ قرآن وحدیث کی فہم کے لئے بھی ان کا علم ضروری ہے اور ان کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لئے بھی عربی ادب وانشا میں ممکنہ مہارت کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں ہے، یہاں بعض دوسری زبانوں سے واقفیت بھی لازمی ہو جاتی ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا، ہم سمجھتے ہیں کہ انگریزی کو مدارس کے نصاب میں داخل کرنے کی کوشش سے علامہ شبلی کا اصلی مقصد بھی یہی تھا، علاوہ ازیں ادب وشاعری کے انسانی ثقافت کا اہم حصہ ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، یہ سب مقاصد محدود وقت میں کیسے حاصل کیے جائیں، اس کا حل علامہ شبلی نے یہ تجویز فرمایا ہے کہ مقصود بالذات علوم کے حصول کی خاطر مقصود بالعرض علوم کے نصاب میں کمی کی جائے، اس ضمن میں یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ قدیم طرز تعلیم میں جتنا وقت صرف ونحو پر صرف کیا جاتا تھا اس میں کمی کر کے ادب وانشا کو زیادہ وقت دیا جا سکتا ہے، علوم عقلیہ جیسے کہ وہ مدارس کے نصاب میں داخل ہیں، اب بڑی حد تک از کار رفتہ ہو گئے ہیں اور ان کا مفہوم یکسر تبدیل ہو گیا ہے، اس لئے انہیں بھی نظر انداز کرنا مناسب ہوگا، جن علوم کی نشان دہی قرآن مجید کے حوالے سے اس خطبے کے آغاز میں کی گئی ہے، ڈیڑھ ہزار برس کی الٹ پھیر میں انہوں نے بھی ارتقا کے بہت سے منازل طے کر لئے ہیں، بہر حال ان سب علوم وفنون کا حصول کسی بھی طالب علم کے لئے ممکن نہیں ہے اور کہیں بھی ایسا نہیں ہوتا ہے۔

جو لوگ جدید تعلیم گاہوں کا تھوڑا تجربہ بھی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہاں مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، لازمی اور اختیاری، غالباً مدارس اسلامیہ نے یہ طریقہ ابھی تک اختیار نہیں کیا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ ہے، اس قابل کہ اس کا تجربہ مدارس میں بھی کیا جائے، بنیادی دینی علوم (قرآن، حدیث، فقہ) اور عربی ادب وانشا اور کوئی ایک ملکی اور ایک غیر ملکی زبان (ہمارے حالات میں ہندی/علاقائی زبان اور انگریزی) کو لازمی مضامین کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے اور باقی علوم وفنون، جن کا ذکر اوپر ہوا، کو (سائنسی علوم کے اضافے کے ساتھ) اختیاری مضامین کے زمرے میں، ہر طالب علم کو اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ذوق ورجحان کے مطابق ان میں سے دو یا تین (جیسا مناسب سمجھا جائے) مضامین کا انتخاب کر لے، مدارس میں مدت تعلیم میں کسی قدر اضافہ کر کے اور اس کو تین میقات میں تقسیم کر کے ابتدائی مرحلے میں صرف وہ علوم پڑھائے جائیں جنہیں

معارف کی ڈاک

دارالمصنفین کی دونئی کتابیں

جی/۴۷ سفینہ اپارٹمنٹ،
میڈیکل کالج روڈ علی گڑھ۔
۱۲رجون ۲۰۰۷ء

مخدومی ومکرمی اصلاحی صاحب

السلام علیکم

ایک ہفتہ قبل پروفیسر ظفر الاسلام صاحب کی معرفت ان کی تصنیف "تعلیم، عہد اسلامی کے ہندوستان میں" ملی، آج بہ ذریعہ ڈاک آپ کی تصنیف "مسلمانوں کی تعلیم" موصول ہوئی، یہ دونوں وقت اور حالات کی ضرورتوں کو بہ درجۂ احسن پوری کرتی ہیں، خوشی کی بات ہے کہ اس کی اشاعت کا سہرا دارالمصنفین ہی کے سر رہا جو ابتدا ہی سے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دل چسپی لیتا رہا، ان پر مضامین اور کتابیں شائع کرتا رہا۔

میرا تعلق شعبہ تعلیم سے نہیں ہے، اس لئے تعلیمی معاملات ومسائل کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں اور اسے مسلمان ماہرین تعلیم کے غور وفکر کی چیز سمجھتا ہوں لیکن آج کل جس شد ومد کے ساتھ اسلامی مدارس میں "عصری تعلیم" کے رائج کیے جانے پر بحث چل رہی ہے اور سرکاری حلقوں کی طرف سے اس کی وکالت کی جارہی ہے، اس سے یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

سائنس اور ٹیکنالوجی مسلمانوں کی متاع گم شدہ ہے، از منۂ وسطی میں ان علوم کی مسلمانوں

میں مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ آپ فارسی قصائد اور انشا اس وقت تک صحیح طور پر پڑھا نہیں سکتے جب تک علم نجوم، علم ہیئت، علم طبیعیات، علم ریاضی، علم طب اور دوسرے سائنسی علوم کے الفاظ و مصطلحات اور ان کے معانی ومطالب سے واقف نہ ہوں لیکن بد قسمتی سے ہم نے خود ہی اپنے علمی سرمایہ کو کھودیا۔

عصری تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں، مسلمان جتنا ہی زیادہ اس کی طرف مائل ہوں ان کے حق میں اچھا ہے کیوں کہ آج کے دور میں اس کے بغیر بحیثیت ایک قوم کے ترقی کرنا ممکن نہیں ہے لیکن اس کے لئے اسلامی مدارس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے حق میں نہیں ہوں کیوں کہ وہ بھی ہماری ضرورت ہیں، ہمیں صرف ڈاکٹر، انجینئر، ٹیکنوکریٹ اور سائنس داں ہی نہیں چاہیے بلکہ محدث، مفسر، مبلغ، خطیب، امام، موذن اور اسلامی علوم کے ماہرین کی بھی ضرورت ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو مغربی ممالک کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا مقابلہ زبان وقلم سے کرسکتے ہیں اور کررہے ہیں۔

اس کے علاوہ ہر مسلمان طالب علم کی دماغی اور ذہنی سطح یکساں نہیں ہوتی کہ وہ سائنسی علوم سے مناسبت پیدا کرسکے اور آج کے دور میں کسی بھی علم میں تخصیص یا مہارت حاصل نہ ہو تو اس کا حصول بیکار ہے۔

عصری علوم کی تعلیم کے لئے حکومت کے تعاون سے ہر شہر میں دوتین انٹر اور ڈگری کالج کھولے جانے چاہئیں، جن کا نصاب ونظام تعلیم علما کی مدد سے تیار کیا جائے اور جن کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، جن شہروں میں مسلمانوں کے اسکول اور کالج پہلے سے موجود ہیں ان میں بھی وہی نظام ونصاب تعلیم رائج کیا جائے اور معیار تعلیم کو اونچا کیا جائے، تب ہی مسلمان صحیح معنوں میں تعلیم میں ترقی کرسکتے ہیں۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند

محمد معتصم عباسی آزاد

لداخی مسافر اور ہندوستان کے تعلیمی مراکز

نوبراہ لیہہ لداخ
یکم ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
مطابق ۲۱؍مارچ ۲۰۰۷ء

حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ مع متعلقین اور کارکنان دارالمصنفین خیریت سے ہوں گے، سب کی خدمت میں سلام عرض کریں، خاص کر ڈاکٹر سلمان سلطان صاحب، حضرت مولانا ابواللیث ندوی اصلاحیؒ کے عزیز خاص (جن کا نام بھول رہا ہوں[1])، دوسرے اصلاحی[2] صاحب جن کے ہاں میں نے ناشتہ کیا اور دارالمصنفین کے دو[3] خدمت گزار جو بس اڈہ تک مجھے پہنچانے آئے تھے، ان سب کی خدمت میں نام بہ نام سلام عرض کریں، ۲۱؍فروری ۲۰۰۷ء کو گھر واپسی ہوئی، متعدد بار آپ کو خط لکھنا چاہا مگر وقت نہیں مل سکا، آج آدھی ملاقات کا شرف حاصل کر رہا ہوں، الحمدللہ آپ کی محبت وضیافت (پرخلوص) ہمیشہ یاد آتی رہتی ہے اور آپ کی میٹھی اور دلآویز باتیں کانوں میں گونجتی رہتی ہیں، کئی بار لداخ پہنچنے کے بعد ٹیلی فون کیا مگر بدقسمتی سے شرف کلام نہیں ہوسکا، کئی بار مجھ سے کہا گیا تھوڑی دیر کے بعد بات کریں مگر پھر مجھے فرصت نہیں ملی، خیر جانے دیجیے یہ سب شکایتیں۔

محمد آباد میں محترم علیگ صاحب[4] نے بہترین قسم کی دعوت کی، کئی لوگ جمع تھے، علیگ صاحب بہت ہی خلیق انسان تھے، بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر ابھی تک نہیں کر پائے ہیں، ان کے پاس زمین وجائداد اور روپیہ پیسہ سب کچھ ہے مگر ان کی رہبری کی ضرورت ہے، میں نے ان کو کچھ مشورے دیئے اور اپنے گاؤں سے مروجہ تعلیم کی جدوجہد کرنے کا مشورہ دیا اور انہوں نے ہامی بھری پھر مئو

[1] جناب فہیم احمد ایڈوکیٹ۔ [2] جناب کلیم صفات اصلاحی۔ [3] امان اللہ و نصیر الدین۔ [4] جناب نسیم فاروقی صاحب۔

پہنچا ہوا وہاں حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب محدث جلیل کے صاحب زادے سے ملاقات ہوئی، ڈاکٹر مسعود (مولانا کے نواسے) کے ہاں رات کا کھانا کھایا، رات کا قیام مدرسہ کے طلبہ کی لائبریری میں کیا، صبح سویرے ہواخوری کے لئے نکلا تو کئی مدرسے دیکھ ڈالے، تین درس نظامی والے (حنفی مدرسے) اور تین اہل حدیث حضرات کے، حنفی مدارس کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہیں ملا، غالباً انہوں نے زیادہ توجہ بھی نہیں دی، اہل حدیث کے دارالعلوم بہت زیادہ فائق اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق تھے، آپ کے قول کے مطابق جو آپ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے انتقال کے موقعہ پر لکھا تھا جو آج ہی میں نے پڑھا اور اس خط کے لکھنے کا باعث بنا، آپ نے فرمایا ہے کہ ''وہ نہ ملت کے جوانوں کی طرح نخچیرِ زمانہ تھا اور نہ پیرانِ کہن سال کی طرح بے گانۂ ایام''، اہل حدیث حضرات نہ ملت کے جوانوں کی طرح نخچیر زمانہ اور نہ پیرانِ کہن سال کی طرح بے گانۂ ایام' وہ زمانہ کے مزاج اور نفسیات کو زیادہ سمجھتے ہیں، ان سب نے میرا پرتپاک استقبال کیا اور میں اس میں اتنا کھویا کہ مولانا اعظمی صاحب کے مدرسہ میں لوٹنے میں کافی دیر ہوگئی اور ان کو ٹیلی فون سے اطلاع دینے کی کوشش کی مگر رابطہ نہ ہوا اور رہبر صاحب نے بھی ان کو میرے بارے میں کوئی خبر نہ دی تو وہ سب پریشان ہوئے اور ہر طرف ٹیلی فون کیا، جب میں واپس لوٹا تو سخت ڈانٹ پڑی، بجا ڈانٹ پڑی، کہنے لگے کہ ''میں مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی کو ٹیلی فون کرنے والا تھا کہ آپ نے کس طرح کے مہمان کو بھیجا ہے''، خیر میں نے معافی مانگی اور پوری تفصیل بتائی، وہاں دل نہ لگا، اسی دن انہوں نے بعد عصر پر تکلف ناشتہ کرایا اور ترش روئی کی معافی مانگی۔

مئو کے ایک مدرسہ میں جانا ہوا جو درس نظامی حنفی والوں کا تھا، مجھے بتایا گیا کہ اس کے سرپرست مولانا سعید الرحمان صاحب اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما ہیں، اس مدرسہ کے شیخ الحدیث سے ملاقات کرنے گیا تو وہ مصروف تھے، بتایا گیا کہ بعد میں آنا، خیر بعد میں جانا نہیں ہوا۔

اہل حدیثوں کے مدرسوں میں مروجہ تعلیم کا اچھا خاصا بندوبست ہے، پھر ندوہ لوٹا ''نصاب تعلیم پر'' مولانا سلمان ندوی صاحب نے جو کانفرنس ملیح آباد میں بلائی تھی، اس میں شرکت ہوئی، کانفرنس تین دن تک چلی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، سوائے قیل وقال اور اعتراض برائے اعتراض کے، اس میں بیرونی ملکوں کے بھی مندوبین تھے، ترکی، سعودی عرب، کویت، قازغستان

کے مفتی عبدالستار صاحب، بنگلہ دیش اور پاکستان کے نمایندے تھے، جمعیۃ العلماہند کے صدر مولانا ارشد صاحب، جماعت اسلامی ہند کے صدر ڈاکٹر عبدالحق صاحب، حضرت ناظم دار العلوم ندوۃ العلما، علمائے اہل حدیث وغیرہ مدعو تھے، بہت سارے مہمان تھے، گرما گرم بحث نصاب تعلیم پر ہوئی، مجھے بھی پانچ منٹ بولنے کا موقع ملا۔

اس کے بعد ایک اور دل چسپ اور معلومات سے پُر، سفر جنوبی ہند کا بنام خدا شروع ہوا، پہلے بھوپال دار العلوم تاج المساجد پہنچا، وہاں مولانا مشتاق ندوی کا قائم کردہ مدرسہ خصوصی کلاسوں پر مبنی دیکھا اور بھوپال کا دار القضا بھی دیکھا وہاں کی مختصر تاریخ معلوم کی، مولانا مشتاق ندوی اور مولانا عبدالسبحان ندوی مہتمم دار العلوم تاج المساجد نے پوری ضیافت کی پھر اس کے بعد ناگ پور پہنچ کر حضرت مولانا پاریکھ صاحب کی عیادت کی، وہ مکمل طور پر نابینا ہوچکے ہیں مگر اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں، پھر اس کے بعد تامل ناڈو چنائی (مدراس) جانا ہوا، وہاں پر بھوپال کے ایک قاری صاحب ملے جن کا پتہ پہلے لے لیا تھا، وہ مولانا پاریکھ صاحب کے خاص آدمی ہیں مگر کوئی تعارفی خط نہیں تھا اس لئے انہوں نے کوئی زیادہ التفات نہیں کیا، میں نے جب ان سے سفر کی غرض وغایت بیان کی اور یوپی کے کئی دار العلوم میں جانے کا تذکرہ کیا اور آیندہ کا پروگرام بتایا تو فرمانے لگے کہ ”کیا اتنے لوگوں سے ملنے اور دار العلوم میں جانے کے بعد بھی آپ کا جی نہیں بھرا، مولانا سلمان ندوی کے مدرسہ میں گیا تھا تو میں نے وہاں عرض کیا کہ مومن کا دل علم سے کبھی نہیں بھرتا اور یہ بھی بتادیا کہ مجھے ٹھہرنے اور کھانے پینے کی کوئی حاجت نہیں، بفضلہ تعالیٰ میں خود سب کچھ انتظام کرسکتا ہوں، انہوں نے مجھے چائے پلائی، چائے تو میں نے پی مگر چائے پینے میں مزا نہیں آیا، پھر میں نے ان سے جماعت تبلیغ کا مرکز پوچھا اور دار السلام عمرآباد کا پتہ پوچھا، انہوں نے پتہ بتایا، پہلے میں تبلیغی مرکز گیا، اس کو دیکھنے کے بعد اس کے بغل میں ایک انگلش میڈیم ہائر سکنڈری اسکول (12th) دیکھنے کا موقع ملا، اس کے پرنسپل صاحب سے مل کر پورے کلاس کا معائنہ کیا، بہت اچھا لگا، تبلیغ والوں کو وقت کی ضرورت کا احساس ہے، انہوں نے اپنے اسکول میں عربی، اردو، انگریزی، تامل اور دیگر موضوعات کو داخل نصاب کیا ہے، اس کے بعد دار السلام عمرآباد پہنچا، انبور نامی جگہ پر ریل سے اترا، وہاں ایک نوجوان ملے، کہنے لگے

کہ کیا آپ پرسنل لا بورڈ کے جلسے میں شرکت کے لئے آئے تھے، میں نے نفی میں جواب دیا اور سفر کی غرض وغایت بتائی، وہ بہت ہی خلیق نکلے اپنی گاڑی سے دار السلام عمرآباد تک پہنچایا، عمرآباد سے میں نے آپ کو ٹیلی فون کیا تھا، اس عربی مدرسہ میں تعلیم وتربیت کا اچھا بندوبست ہے، نومسلموں کے لئے الگ سے ٹھہرنے اور تعلیم وتربیت کا بھی معقول انتظام ہے، یہ لوگ غالی اہل حدیث نہیں ہیں، زمانہ شناس، مردم شناس اور وسیع القلب ہیں، مہتمم صاحب ایک نیپالی مولانا صاحب ہیں، مجھے اجنبیت اور غیریت کا احساس تک نہیں ہونے دیا، درجوں میں گیا، طلبۂ عظام ہر جگہ ایک جیسے لگے، دار السلام میں مجھے نومسلم طلبہ نے دو دن تک گھیرے رکھا، دوسرے طلبہ کو شکایت ہوئی کہ مہمان سے ہمیں استفادہ کا موقع نہیں ملا، میں نے نومسلم طلبہ کی چائے پانی کے ذریعہ خدمت کی اور کتابوں کا تحفہ پیش کیا، بہت ہی مخلص اور ایمان واسلام کی نعمت کے قدردان تھے، خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی دولت ولذت سے آشنا کیا، میں نے ان سب کو گلے لگایا اور ان کے ہاتھ چومے، وہ آخری دن بس اڈے تک تقریباً دس کلومیٹر تک آئے اور مجھے رخصت کرکے واپس ہوئے، دار السلام والوں کے پاس اپنا ہسپتال بھی ہے، اس میں بہت مختصر رقم لے کر علاج ہوتا ہے، انہوں نے بہت اچھی مثال قائم کی ہے، ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ان کی ایک مسجد کے امام حنفی المسلک قاری وحافظ تھے، وہ مسلک سے زیادہ صلاحیت کے قائل ہیں، اس کے بعد بنگلور گیا وہاں مولانا سید مصطفےٰ رفاعی ندوی نے بہت رہبری کی ان کی وجہ سے بہت سہولت ملی اور ان کے مشورے کے مطابق حضرت ٹیپو سلطانؒ کے دار الخلافہ سری سرنگا پٹن میسور جانا ہوا، وہاں ضیاء اللہ شریف کا قائم کردہ دار الامور دیکھا، اس میں مختلف مدارس اسلامیہ کے فارغ التحصیل مولویوں کو انگریزی، کمپیوٹر، حساب، سائنس اور عام معلومات کی اور انجینئر حضرات کو عربی ودینیات کی تعلیم دی جارہی تھی، یہ بہت پسند آیا اور ایک نیا تجربہ سامنے آیا جس کا نقشہ وسانچہ میرے دل ودماغ میں لداخ میں تھا، میں نے اسی طرز پر ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ چند مولویوں کی مخالفت کی وجہ سے عمل میں نہیں آیا، اس نقشہ کی عملی تصویر میں نے سلطان ٹیپو کے مزار کے پاس قائم شدہ مدرسہ میں عملاً دیکھی، اللہ تعالیٰ قوم کے ان محسنوں کو جزائے خیر دے، اس میں جناب ضیاء اللہ شریف صاحب جیسے صاحب ثروت کے علاوہ ڈاکٹر قمر الدین صاحب

بھی پیش پیش تھے، ڈاکٹر موصوف سے تفصیل سے بات ہوئی۔

مولانائے محترم!

صحیح عرض کرتا ہوں کہ یہ بے ریش اور یونی ورسٹیوں کے پروردہ لوگ ہمارے دینی مدارس کے علما وفضلا سے اخلاص واخلاق میں بہت بڑھے ہوتے ہیں، مجھ کو انہوں نے بنگلور سے وہاں تک آنے جانے کا خرچ اور کرایہ دیا، بنگلور میں مولوی یوسف ندوی فرشتہ رحمت نکلے، مولانا الیاس بھٹکلی کی ہدایت کے مطابق انہوں نے اپنی موٹر سائیکل پر خوب گھمایا اور بہت ہی مدد کی، اللہ ان کو جزائے خیر دے، مولانا اشرف علی امیر شریعت کرناٹک کے مدرسہ سبیل الرشاد میں بھی جانا ہوا، وہاں تمام طلبہ عمامے میں تھے، اس کے علاوہ مدرسہ دار التوحید بنگلور میں بھی جانا ہوا، وہ ندوہ کے طرز پر قائم ہوا ہے، اس میں ایک حافظ صاحب ملے، انہوں نے مدرسہ کی زمین خریدی ہے اور وہی اس کے ناظم ہیں، حافظ صاحب نہایت خلیق وملنسار تھے، مجھے ہدیہ پیش کیا، اس کے بعد بھٹکل جانا ہوا، بھٹکل میں جامعہ اسلامیہ جانا ہوا، طلبہ سے خطاب ہوا (اوپر یہ بات رہ گئی تھی کہ میرا خطاب دار الامور سلطان ٹیپو کے علما اور انجینئر کے سامنے بھی ہوا تھا) کرناٹک سرکار کا قائم کردہ Muslim Tribal ہوسٹل دیکھا، تقریباً ۵۰۰ طلبہ وطالبات زیر تعلیم تھے، دار الامور کے مولوی حضرات صبح جا کر ان کو دینیات پڑھاتے ہیں، اس کا اچھا خاصا اثر ہوتا ہے میں نے وہاں جا کر ایک دو کلاس لئے اور طلبہ وطالبات سے خطاب کرنے کا موقع ملا، وہاں پر ہمارے دوست مولانا عبد الباری ندوی مہتمم ہیں، عربی تعلیم پر زور ہے مگر انگریزی اور کنڑ زبان کی کما حقہ تعلیم نہیں ہو رہی ہے۔

ہمارے تمام دینی مدارس صفائی کے معاملے میں کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے بہت پیچھے ہیں، میں نے ذمہ داروں کو کچھ مشورے دیئے اور جامعہ فلاح کے نائب مہتمم صاحب کی بات نقل کی کہ ہمیں تعریف کی ضرورت نہیں ہماری غلطیوں کی نشان دہی کی جائے، پھر بھٹکل کا دار القضاء دیکھا، حضرت حسن البناؒ کے نام پر ایک لائبریری دیکھی، کتابیں کافی ہیں، پڑھنے والے نہیں کے برابر، پھر وہاں کا ڈگری کالج دیکھا، وہاں کیرلا کے ایک صاحب علم بہت ہی ملنسار و خلیق آدمی پرنسپلی کی خدمت انجام دے رہے ہیں، بھٹکل میں خالص یمنی النسل اور بہت با اخلاق لوگ ہیں، وہاں پر شادی کی ایک دعوت میں شریک ہوا، خطبہ نکاح عربی میں ہوا، ایجاب وقبول

عربی ومقامی زبان میں ہوا، میں نے قاضی صاحب کو بتایا کہ کاش! آپ خطبہ نکاح کا ترجمہ اردو یا مقامی زبان میں کرتے تو بہت اچھا ہوتا، ہمارے علما کو موقع سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ بہت کم ہے، پھر بھٹکل کے قریب ایک گاؤں میں جانا ہوا، اس کا نام تنگن گونڈی ہے، اس کا مطلب ناریل ہے، بہت ہی غریب بستی ہے وہ عربی النسل مچھیرے تھے، ان کے ساتھ چھوت چھات کا سا معاملہ ہوتا ہے، ان کے ساتھ شادی نہیں ہوتی ہے، میں نے ان لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی، بہت ہی خلوص سے ملے، ان میں غربت بہت اور تعلیم کی بڑی کمی ہے۔

مولانائے محترم!

غریب مسلمان کہیں کے بھی ہوں ان کے حالات بہت دگرگوں اور وہ بے چارے بڑی کس مپرسی کی حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔

بھٹکل کے بعد دار العلوم ندوہ واپسی ہوئی اور پھر دار العلوم دیوبند میں حاضری ہوئی، دورہ حدیث کے چھ درس میں شامل ہونے کا موقع ملا بہت ہی اچھا لگا، تقریباً آٹھ سو طلبہ دورہ حدیث میں تھے، دو روزہ قیام کے دوران حضرت مولانا سالم صاحب مہتمم دار العلوم وقف، حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب مہتمم دار العلوم کی عیادت کرنے کا موقع ملا، دیوبند کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیاں دور ہوئیں، انہوں نے اب Department of Eng کھولا ہے اس میں کچھ طلبہ ملے، وہ عربی وانگریزی بولتے تھے۔

اس کے بعد پھلت جانا ہوا مولانا کلیم صدیقی صاحب جامعہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے روح رواں اور بانی ہیں، غیر مسلموں میں دعوت کے حریص اور عملی داعی ہیں، تقریباً ۵۰ علما کو ٹریننگ دی جا رہی تھی کہ دعوت کا کام کیسے کیا جائے، اس کے بعد دہلی تبلیغ کے مرکز آنا ہوا، اس کے بعد ہریانہ Jajjar جانا ہوا جہاں پر میرا ایک بیٹا پڑھتا ہے، Kindiyara ودھیالہ میں، وہاں طلبہ سے خطاب کرنے کا موقع ملا، Jajjar اور Bahadurgarh ہریانہ میں مسجدوں کا حال بہت خراب ہے چند مسجدوں کو بہاریوں اور میواتیوں نے آباد کیا ہے باقی مسجدیں غیروں کے قبضے میں ہیں، یہاں ایک بھی مقامی مسلمان نہیں ہیں، سب پاکستان چلے گئے ہیں، اس سے دل پر ایک چوٹ لگی کہ مسلمانوں نے اپنا مقصد حیات کھو دیا ہے اور وہ غیروں کے نقش قدم پر چل

رہے ہیں، پھر دہلی واپس آیا جامعہ ملیہ اور J.N.V. University دیکھی، بہت سے ہال
دیکھے جن میں طلبہ وطالبات کا وہ اختلاط دیکھا جس کو دیکھ کر شیطان بھی شرمائے گا، اس کے بعد
میری آخری منزل لداخ پر ختم ہوئی، اس دورہ سے ایک بات کھل کر سمجھ میں آئی کہ جب تک
مسلمان اتحاد، تعلیم اور مسلک سے اوپر اٹھ کر کام نہیں کریں گے ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھیں گے،
اگر انہوں نے قرآن وسنت پر عمل کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ، صحابہ وتابعین، ائمہ محدثین و
فقہائے عظام کا طریقہ اپنایا تو وہ ہر جگہ کامران وبامراد ہوں گے، وَلَا تَهِنُوْا وَلَا
تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

والسلام
آپ کا خیر اندیش
دعا جو و دعا گو
محمد عمر ندوی

(نوٹ: مولانائے محترم! معاف فرمائیے! آپ کو پوری داستان سنائی، آپ سے بہت
زیادہ محبت ہوگئی ہے اس لئے پوری تفصیل اور سفر کی روداد تحریری شکل میں صرف آپ کو لکھا)
محمد عمر ندوی

جامع معمر یا جامع عبدالرزاق

ادب کدہ مہراج پور،
انور گنج، اعظم گڈھ
۲۶/جون ۲۰۰۷ء

گرامی قدر جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف اکتوبر ۲۰۰۶ء میں مصنف عبدالرزاق اور جامع معمر ابن راشد کے متعلق راقم کا جو مراسلہ شائع ہوا تھا، اس کے جواب میں ڈاکٹر مسعود الاعظمی نے جون ۲۰۰۷ء کے شمارے میں جو مضمون لکھا ہے اس کے بارے میں چند باتیں عرض کرنی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

راقم نے واضح کیا تھا کہ دونوں مرحوم محققین اپنے اپنے موقف پر قائم رہے، اس لئے یہ اب بھی موضوع بحث وتحقیق ہے کہ آیا مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع، جامع عبدالرزاق ہے یا جامع معمر ابن راشد۔ (معارف اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۸)

یہ ایک علمی بحث تھی اور مزید تلاش وتفحص کی ضرورت تھی کہ فاضل محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے جن دو مخطوطات کا ذکر کیا تھا اب وہ کس حال میں ہیں اور انہوں نے جن ترک محققین یا مستشرقین کا ذکر کیا تھا کہ وہ ان کی طبع واشاعت کی فکر میں تھے، وہ شائع ہوئے یا نہیں یا اب ان کا موقف کیا ہے، مگر افسوس کہ اس علمی بحث وتحقیق میں نہ پہلے علمی اور معروضی طرز اختیار کیا گیا تھا اور نہ اب ڈاکٹر مسعود الاعظمی نے سنجیدگی سے کام لیا ہے بلکہ ان کے مضمون میں جا بجا سطحیت و رکاکت بھی جگہ پا گئی ہے، وہ چیں بہ جبیں ہیں کہ مجھے البعث الاسلامی میں شائع مضمون پڑھے بغیر اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے تھا حالاں کہ میں نے ڈاکٹر صہیب صاحب کے خلاصے پر اکتفا کیا تھا اور اس کی تصریح بھی کردی تھی، اب خود مسعود الاعظمی صاحب نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسے فاضل محقق کے رد کے لئے اصل دلائل (مطبوعہ) الرشاد دیکھنے کی بجائے ڈاکٹر صہیب صاحب کے خلاصے پر اکتفا کیا ہے، جو باتیں انہوں نے البعث کے حوالے سے میرے متعلق لکھی ہیں وہی باتیں براہ راست الرشاد سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے خود ان پر بھی عائد ہوتی ہیں کہ کیا الرشاد کوئی عنقا قسم کی چیز تھی۔

راقم نے اپنے مراسلے میں لکھا تھا کہ مولانا الاعظمیؒ نے ڈاکٹر صاحب کے دلائل رد کرنے کی بجائے اپنے موقف کی تائید میں مزید دلائل فراہم کیے، اب یہی بات ڈاکٹر مسعود الاعظمی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر حمید اللہ کے دلائل کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا تو وہ اس کے جوابات کیا لکھتے، انہوں نے بھی اپنے پیش رو بزرگ کی طرح محض بے وزن دلائل فراہم کیے ہیں ان کا یہ حال ہے کہ چند بوسیدہ اوراق سے بھی وہ استدلال کرتے ہیں۔

البعث الاسلامی میں محدث جلیل کا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس کے متعلق انہیں عرصے تک اشتیاق رہا کہ آیا اس سلسلے میں محقق جلیل ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا کیا موقف رہا (دار العلوم مئی ۱۹۹۵ء، ص ۲۹ بحوالہ معارف ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۶) مگر ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں

کبھی اپنے لب وانہیں کیے حالاں کہ وہ معارف اور بعض دوسرے رسائل میں علمی مراسلے لکھتے رہے، اب سوال یہ ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہوئی کہ پھر انہوں نے اس سلسلے میں کبھی اظہار خیال نہیں کیا، راقم کا خیال ہے کہ ان کے سلسلے میں محدث جلیل نے جو انداز تحریر اختیار کیا تھا غالباً اس سے دل برداشتہ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے خاموشی اختیار کر لینے ہی میں عافیت محسوس کی، مثلاً ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کو انہوں نے ان کے استشراق کا نتیجہ قرار دیا اور نہایت نامناسب انداز میں ان کا جواب لکھا، ایک اقتباس ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

> "مصنف عبدالرزاق کی آخری کتاب کتاب الجامع کو جامع معمر قرار دینے والوں نے اس کی اکثر حدیثوں کو بہ روایت معمر پا کر اپنے استشراق کے زور سے اس کو جامع معمر یقین کر لیا، وہ اور کچھ نہیں پوری کتاب الجامع کو حرفاً حرفاً پڑھ لیتے تو یہ دعوا کرتے ہوئے ان کو خود شرم محسوس ہوتی"۔ (ماہنامہ الرشاد، اعظم گڈھ، مئی ۱۹۸۳ء ص ۴۶)

محدث جلیل کا یہ جواب جب ماہنامہ الرشاد میں شائع ہوا تھا تو اس کے فاضل مدیر مرحوم مولانا مجیب اللہ ندوی نے اس پر ایک نوٹ لکھا، جس میں مولانا الاعظمی کے بعض دلائل کو کم زور اور بعض دلائل کو مضبوط قرار دیا ہے اور شکوہ کیا ہے کہ مولانا الاعظمی نے جو غصہ کا انداز اختیار کیا ہے، وہ ان کے شایان شان نہیں۔ (الرشاد، مئی ۱۹۸۳ء، ص ۴۷)

اس کے جواب میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے نہایت سنجیدگی سے اپنے دلائل دیئے اور آخر میں لکھا کہ:

> "ممکن ہے اس کے باوجود میں ہی غلطی پر ہوں اور کتاب الجامع کے وہ معنی متفرقات کے باب کے ہوں لیکن اس کے خلاف رائے رکھنے کو استشراق یعنی کفر قرار دیا جاسکتا ہے تو میں علام الغیوب سے استغفار کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اھدنا الصراط المستقیم"۔ (الرشاد، جون و جولائی ۱۹۸۳ء ص ۲۷)

البعث الاسلامی میں بھی کم و بیش یہی انداز و اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور اب ڈاکٹر مسعود الاعظمی نے بھی اسی کی اقتدا کی ہے جو اس بحث کے خاتمے کے لئے ناکافی ہے اور مزید تحقیق

وجستجو کی متقاضی ہے مگر اس کے باوجود میں خود اس بحث سے ہاتھ اٹھاتا ہوں، اس لئے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسا نیک دل اور بزرگ محقق مطعون کیا جاسکتا ہے تو پھر اس ہیچ مداں کی کیا حیثیت۔

والسلام

محمد الیاس الاعظمی

معارف: مولانا حبیب الرحمان الاعظمیؒ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کے درمیان یہ امر متنازع ہو گیا تھا کہ مصنف عبدالرزاق کے آخر میں شامل جامع اس کا حصہ ہے یا وہ عبدالرزاق کے استاد معمر بن راشد کی جامع ہے، مولانا کے نزدیک وہ مصنف کا حصہ اور ڈاکٹر صاحب اسے معمر بن راشد کی جامع قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود الاعظمی مولانا حبیب الرحمان الاعظمی کے نواسے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آخر میں ڈاکٹر حمید اللہ مولانا الاعظمی کی رائے سے متفق ہو گئے تھے، اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مولانا کا اس سلسلے کا آخری مقالہ جو البعث الاسلامی لکھنؤ میں شائع ہوا تھا وہ ڈاکٹر صاحب کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا مگر انہوں نے اس کے جواب میں کوئی مقالہ سپرد قلم نہیں کیا، راقم کے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی نظر سے چاہے البعث الاسلامی کا مضمون گزرا بھی ہو تب بھی وہ اس کی دلیل نہیں کہ ڈاکٹر صاحب مولانا الاعظمی کی رائے سے متفق ہو گئے تھے، کبھی آدمی اس لئے بھی خاموش ہو جاتا ہے کہ وہ مخاطب سے مایوس ہو جاتا اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی بات کی پچ کر رہا ہے، اس لئے اس کی بات نہیں مانے گا اور اب اس سے مزید بحث بے کار ہے، یہاں قرینہ یہی معلوم ہوتا ہے، پھر ڈاکٹر صاحب کے موقف کی تبدیلی اسی وقت قابل قبول ہوگی جب ڈاکٹر صاحب کی کوئی واضح اور صریح تحریر اس کے ثبوت میں پیش کر دی جائے۔

بہرحال اب معارف میں اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش نہیں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے تو سپر ڈال ہی دیا ہے۔

☆☆☆

مطبوعات جدیدہ

غالب اور رام پور: از جناب شاہد ماہلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۲، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔

غالب کے تہہ در تہہ مطالعہ میں ایک دل چسپ مقام، مقامات غالب بھی ہے، رجال واشخاص کی طرح غالب کے محققین نے دہلی، آگرہ، لکھنؤ، بنارس، کلکتہ جیسے مقامات سے اعتنا کیا، اس فہرست میں دارالسرور رام پور کی اہمیت بھی کم نہیں، غالب انسٹی ٹیوٹ نے ان شہروں میں غالب کے تعلق سے سمینار منعقد کیے، زیرنظر کتاب میں رام پور کے غالب سمینار کے مقالات ہیں جن میں غالب اور رام پور کے حوالے سے بائیس اہل قلم نے موضوع کا شاید ہی گوشہ تشنہ چھوڑا ہو، صرف دو مضامین سید امیر حسن عابدی اور پروفیسر خلیق انجم کے ایسے ہیں جن میں براہ راست غالب کا ذکر نہیں، شمیم حنفی کے مقالے سے یہ بحث شروع ہوتی ہے کہ رام پور سے غالب کی نسبت سے ایک الگ تصویر ابھرتی ہے جس میں معاشی اور جذباتی عناصر کے علاوہ انسانی عناصر واوصاف اور زندگی سے معمور سطح کی استواری بھی ظاہر ہوتی ہے، نثار احمد فاروقی مرحوم نے ان اصل خطوط اور اشعار کی جانب توجہ دلائی ہے جن کا ذکر مکاتیب غالب مرتبہ عرشی میں ہے لیکن اصل اب مفقود ہے، باقی اور مضامین میں والیان رام پور سے متعلق غالب کے قصائد، رام پور میں غالب کے احباب وتلامذہ ومعاصرین وغیرہ پر جدا جدا رنگ میں اظہار خیال کیا گیا ہے، رضا لائبریری میں غالبیات کے ذخیرے پر ابوسعد اصلاحی کا مضمون محققین غالب کے لئے پراز معلومات ہے، فاضل مرتب کا یہ خیال درست ہے کہ ''یہ کتاب اہل علم کے لئے ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے اور اس کا شمار غالبیات کی اہم کتابوں

میں ہونا چاہیے''۔

عبدالمطلب ہاشمی: از پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع خوب صورت گرد پوش، صفحات ۱۲۰، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی، نمبر-۲۔

رسول اکرم ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب کی اہمیت، سیرت نگاران رسول ﷺ کی نظر میں صرف اس لئے ہے کہ وہ ان شخصیتوں میں ہیں جن کی تربیت نے جناب رسول اللہ ﷺ کے بچپن میں ہی شخصیت سازی کے اثرات مرتب کیے لیکن یہ اہمیت کبھی کبھی تقدس کے اس مقام سے جاملتی ہے جو بہ قول فاضل مصنف ''تاریخ وسیرت دونوں کو مسخ کردیتا ہے'' ان کو یہ احساس بھی ہے کہ مصادر میں کافی مواد کے باوجود عبدالمطلب کے بارے میں سیرت نگاروں نے معلومات کم ہی فراہم کیے، توجیہ جو بھی ہو لیکن وہ اس مختصر نویسی کے جواز کے لئے کافی نہیں، اس کمی کی تلافی کے لئے اس کتاب میں جناب عبدالمطلب کے خاندانی پس منظر، مکہ میں ان کے مناصب، جنگی اور مالی حکمت عملی، بیرونی اسفار، اکابر قریش سے تعلقات، ازدواجی بندھن اور ان کے آثار وباقیات پر سیر حاصل بحث کے علاوہ آنحضور ﷺ اور جناب عبدالمطلب کے رشتوں کے ہر جزیئے پر نظر کی گئی ہے، یہ مطالعہ بڑا دل چسپ ہے، مثلاً دادا نے اپنے بعد حضور اکرم ﷺ کی کفالت کی جو وصیت فرمائی اس کی روشنی میں سیرت نگاروں نے بالعموم صرف جناب ابوطالب کو کفیل قرار دیا لیکن فاضل مصنف کی نظر میں حضرت زبیرؓ بھی سگے چچا ہونے کے لحاظ سے راست مربی اور کفیل خاص تھے لیکن سیرت نگاروں نے متداول اور درایتی معیار کے عین مطابق روایتوں کو نظرانداز کر کے کم زور بیانوں کو زیادہ ترجیح دی، اسی طرح جناب عبدالمطلب کے بیان میں ان کے دین ومذہب کی بحث بھی بڑی اہم ہے کہ خوش بیان راویوں نے ان سے ایسے عقائد منسوب کردیے جو اسلام اور قرآن کا عطیہ ہیں، حالاں کہ بہ قول مصنف ان کی موت جاہلیت پر ہوئی، اسی طرح عبدالمطلب اور ان کے آباواجداد کے ناموں کے متعلق بحث بھی معلومات انگیز ہے کہ ہاشم کا اصل نام عمرو، عبدمناف کا مغیرہ، قصی کا زید اور خود عبدالمطلب کا اصل نام عامر تھا، اصل ناموں کی یہ گم شدگی فاضل مصنف کے خیال میں ''راویان خوش بیان کی فرط عقیدت وملمع سازی

کی بنا پر ہوتی رہی" عبدالمطلب کے سن پیدائش کی تعیین میں سیرت نگاروں سے اختلاف اور ترجیح کی وجہ بھی، قرین قیاس نظر آتی ہے، البتہ یہ کہنا کہ ہاشم کی پہلی بیوی ہند بنت عمرو خزرجی کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا گیا، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی گئی، اس نکتہ پر بار بار زور دیا گیا کہ شخصیت پرستی کی خاطر راویان خوش بیان نے قصہ گویوں کی روایتوں اور کہانیوں کو قبول کر کے رواج دیا اور وہ اب صحیح احادیث و آثار کی مانند معتبر روایات سمجھی جاتی ہیں، یہ شاید زیادتی ہے، عبدالمطلب کی نذر کے نتیجے میں آنحضورﷺ کے والد ماجد کی قربانی کا قصہ یقیناً خوش عقیدگی کی مثال ہے لیکن جب خود ابن اسحاق اور ابن ہشام اس کو عوامی کہانی مانتے ہیں تو بعد کے قصہ گویوں کے تائیدی اعتبار کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے؟ یہ کہنے میں قطعی تامل نہیں کہ اس کتاب سے عبدالمطلب ہاشمی کی شخصیت تاریخی تناظر میں زیادہ مکمل اور زیادہ واضح شکل میں سامنے آتی ہے، فاضل مصنف نے جزئیات کا جس طرح استقصا کیا ہے وہ مطالعہ و تحقیق کا بہترین نمونہ ہے۔

قوام العقائد: مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۴۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: ادارہ نشر و اشاعت، جامع العلوم فرقانیہ، مسٹن گنج، رام پور۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حالات و ملفوظات میں فوائد الفواد، درر نظامی اور سیر الاولیا کی شہرت ہم عصر کتابوں کی حیثیت سے ہے، اس فہرست میں قوام العقائد نامی ایک مختصر رسالہ بھی ہے، اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ زمانی اعتبار سے یہ فوائد الفواد کے بعد آتی ہے، خواجہ صاحب کے ایک مرید و خلیفہ خواجہ قوام الدین معروف بہ شمس العارفین نے اس کی روایتوں کو بیان کیا، یہ قیمتی کتاب مخطوطہ کی شکل میں محفوظ لیکن عام نگاہوں سے مستور تھی، فاضل مترجم مرحوم نے اس کو حاصل کیا اور فارسی سے سلیس ترجمہ اور بعض ضروری حواشی کے ساتھ رسالہ "ضیاء وجیہ" میں پہلی بار شائع کیا اور اب کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے، پہلے باب میں جن اشعار سے حضرت نظام الدین اولیا کا ذکر شروع ہوتا ہے، اسی سے روایات و ملفوظات کے نہج کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ (حضرت) "سب امتوں کے شیخ، دنیائے حقیقت کے نظام جو اپنے مردہ ہڈیوں ہڈیوں کو زندہ کردینے والے نفس سے خضر و مسیح کا مرتبہ رکھتے ہیں .... چوں کہ ان

کے دہن سے الہامی باتیں نکلتی ہیں، ان کا الہام بھی وحی کا قائم مقام ہے" اس کے بعد کثرت سے ایسی روایتیں ہیں جن سے حضرت نظام الدین اولیا کے علم و عمل اور اصلاح و تربیت کے مختلف مدارج کا اندازہ ہوتا ہے، ان روایتوں میں لذت و حلاوت بھی ہے اور سامان بصیرت بھی، خواجہ صاحب کے بعض اقوال آخری باب میں جمع کیے گئے ہیں جیسے یہ کہ "دلوں کے اعمال کا ایک ذرہ اعضا کے اعمال کے پہاڑوں سے بھی افضل ہے"۔

سوانح حیات حضرت مولوی محمد سعید خاںؒ: از جناب آزاد رسول، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۸۸، قیمت ۱۶۵ روپے، پتہ: ادارہ تلاش حق ۱۱۹، نور نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اعظم گڈھ کے ایک گاؤں نوناری کے ایک سیدھے سادے، خاموش، کم آمیز انسان اور شبلی اسکول کے عربی مدرس مولوی محمد سعید خاں جب ایک مجددی بزرگ حضرت حامد حسن العلوی کے دامن سے وابستہ ہوئے تو تزکیہ نفس اور عروج روحانی میں ان کی ریاضت ایک مثال بن گئی، اپنے سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت میں وہ تاعمر مجسم جد و جہد ہو گئے، ان کے اخلاص و برکت سے ان کا سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ ہندوستان اور بیرون میں کثرت سے اس کے مراکز قائم ہوئے، ان اسلاف کے برخلاف جو گوشہ نشین ہوتے اور تجرد کی زندگی گزارتے ہیں، مولوی صاحب نے متاہل اور ملازمت کی زندگی کے باوجود بہ قول مصنف محترم اسلاف کی طرح ولایت و تقرب کے اعلا درجات حاصل کیے بلکہ اس سے بھی آگے کی خبر لائے، پوری کتاب اسی اجمال کی دل کش تفصیل ہے، احیائے تعلیم طریقت، تصوف اور عصر جدید کے تحت مولوی صاحب کے منہج رشد و ہدایت کو عقیدت کی زبان میں بیان کیا گیا ہے، گرچہ یہ احساس بھی ہے کہ چوں کہ تصوف کی تعلیم، ائمہ ہدایت کے روحانی اثرات سے طالبین کے باطن کی تربیت کا نام ہے، اس لئے تحریری شکل میں پیش کرنا ممکن نہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ مسائل تصوف کو اس میں بڑی آسانی سے بیان کیا گیا ہے، فاضل مرتب جدید تعلیم کے نمائندے ہیں، فلسفہ سے خاص تعلق رہا، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے دانش وروں کی تربیت میں رہے لیکن ذہن کی تمام گتھیاں حضرت مولوی سعید خاں مرحوم کی توجہات سے حاصل ہوئیں، ان کے قلم سے اپنے مرشد کی سوانح اور تعلیمات کا یہ

مرقع محض کسی خوش عقیدگی کا نتیجہ نہیں، اس کی عمدہ مثال خاص طور پر تصوف اور عصر جدید کے عنوان سے ان کی تحریر ہے مگر بعض مقامات پر ایسی باتیں آگئی ہیں جو ظاہر بینوں کے لئے عجیب ہی کہی جائیں گی، جیسے یہ احساس کہ ''حضرت والا میں لطافت حد درجہ تھی، کوئی مریض قریب آ کر بیٹھتا تو اپنے آپ اچھا ہو جاتا''، یہ کہنا بھی شاید کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی تصوف کے قائل نہیں تھے، پاکستان جانے کے بعد قائل ہوئے، بعض روایتیں تنقیح طلب ہیں، مثلاً یہ کہ شاہ ولی اللہؒ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوا کہ نماز کی پابندی ہٹائی جائے تو آپ نے دعا کی کہ الٰہی یہ مجھے عزیز ہے، اس لئے پابندی نہ اٹھائی جائے یعنی ہوش میں رکھا جائے، فاضل مصنف اب رحمت حق سے جاملے ہیں لیکن امید ہے کہ اس کتاب اور ان کے ادارہ تلاش حق کے ذریعہ ان کے درجات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

معاصرین مبارک: از جناب سید مبارک شاہ جیلانی، ترتیب و تہذیب جناب سید انیس شاہ جیلانی، قدرے بڑی تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۵۱۸، قیمت درج نہیں، پتہ: مبارک اردو لائبریری، محمد آباد، تحصیل صادق آباد، پاکستان۔

پاکستان کے بھاول پور علاقے کے ایک بالکل غیر معروف گاؤں کی ہی ایک غیر معلوم شخصیت کی خود نوشت یادوں کا یہ مجموعہ اصلاً ایک کشکول ہے جس سے قریب ایک صدی قبل کے بعض مخصوص معاشروں اور اس سے زیادہ ادب اور ادیبوں سے محبت و عقیدت کے ایسے مسرت بخش اور حیرت انگیز معلومات ملتے ہیں کہ سینکڑوں صفحات کی ورق گردانی کے بعد طبیعت سیر نہیں ہوتی، سید مبارک شاہ جیلانی ایسے علاقے میں تھے جہاں اردو ادب کیا اردو سے ہی ناواقفیت تھی لیکن ایسے ماحول میں انہوں نے محض ذاتی استعداد سے اپنے معیار و مذاق علم و ادب کو ایسا بلند کیا کہ زیر نظر کتاب میں موجود ان کی ہر تحریر مہدی افادی جیسے انشا پرداز کی یاد دلاتی ہے، اردو کی محبت کی وجہ سے وہ یوپی والوں پر جان چھڑکتے تھے، نیاز فتح پوری سے اتنے متاثر تھے کہ اس زمانے میں دور دراز سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے وہ بھوپال پہنچے، وہاں سے لکھنؤ آئے، وصل و ریاض اور عزیز و صفی سے ملے، یہ روداد بس پڑھنے کے لائق ہے، مولانا آزاد اور مولانا دریابادی سے اتنے متاثر تھے کہ اپنے بیٹے اور پوتے کا نام ان کے نام پر رکھا، ''معارف'' کے وہ اولین خریداروں میں

تھے، دارالمصنفین کی طرز پر اپنے علاقے میں ادارہ قائم کرنے کی خواہش تھی، مبارک لائبریری کے نام سے اس کا آغاز کیا تو اس کے دستور میں لکھا کہ دارالمصنفین کا ناظم ہمیشہ اس کا ممبر ہوگا اور مولانا سید سلیمان ندوی اس کے ممبر بھی رہے، رئیس احمد جعفری کے لئے کوشش کرتے رہے کہ وہ ان کی بستی کے جوار میں بسیں، زندہ دلی، خوش مزاجی، عقل پرستی اور مذہبی غلو اور بندشوں سے آزادی اور سب سے زیادہ مزاج کی نفاست کے جو مرقعے اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں وہ واقعی ان کو مہدی ثانی بناتے ہیں، سندھی اور سرائیکی کی سرزمین سے نگارستان نامی رسالہ نکالا اور اس کی ادارت کے لئے روش صدیقی کا انتخاب کیا، اقبال کے کلام کا انتخاب ایسا کیا کہ رئیس احمد جعفری نے لکھا کہ اس سے اچھا انتخاب نہیں کیا جاسکتا، اس کتاب کے مرتب نے لکھا کہ ''وہ مرحوم اول و آخر اردو تھا'' یہ مرتب کوئی اور نہیں ان کے صاحب زادے ہیں اور ان کا نام بھی اردو کے اس شیدائی نے میر انیس کے نام پر رکھا تھا، اور یہ ان کے تمام جذبوں، آرزوؤں اور خوابوں کی تعبیر مجسم ہیں، ''غریق شعر و سخن'' کے عنوان سے انہوں نے اپنے والد مرحوم پر جو تحریر سپرد قلم کی ہے، اب لکھنؤ کے اہل زبان بھی شاید اس سے بہتر نہ لکھ سکیں، انہوں نے اپنے والد کے سوانح لکھ کر اور ان کے معاصرین کے بارے میں ان کی تحریروں کو جمع کر کے ایک سعادت مند فرزند ہونے کے علاوہ ایک بہترین انشا پرداز سے بھی روشناس کرایا، ان کے والد کی غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست دیکھنے کے بعد اب ان کے مطبوع ہونے کی آرزو فطری ہے، خدا کرے کہ یہ جلد پوری بھی ہو۔

اشاریہ سہ ماہی نیا دور کراچی: از جناب مصباح العثمان، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۲۸، قیمت ۲۰۰، پتہ: بزم تخلیق ادب BTA، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶۶۷، کراچی، پاکستان۔

پاکستان کے نمایاں ادبی رسالوں میں ایک نام نیا دور کراچی کا بھی ہے، مشہور محقق اور ادیب جناب جمیل جالبی نے اس رسالے کو ۵۵ء میں اس وقت شروع کیا جب اسی نام کا ایک اور رسالہ ۵۰ء میں بند ہو چکا تھا، یہ نقش ثانی بھی ۱۹۹۳ء میں مٹ گیا لیکن قریب تینتالیس سالوں میں اس نے اردو ادب کی بعض حیثیتوں سے مثلاً مغربی ادب کے مختلف رجحانات اور اردو افسانہ نگاری کے متعلق قابل قدر اضافے کیے، بہ قول جمیل جالبی ''تنقیدی مضامین، تبصرے اور جدید شاعری

کے نمونے بھی قابل ذکر ہیں''، اس کے مضمون نگاروں کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوپاک کے قریب ہر اہم صاحب قلم کا تعاون اس رسالہ کو مسلسل حاصل رہا، ایسے اہم رسالہ کے اشاریے کی ضرورت تھی اور اب جب کہ اردو کے اہم رسالوں کے اشاریوں کا چلن ہے، یہ اشاریہ اس میں ایک مفید اضافہ ہے، نیادور کے متعلق کہا گیا کہ یہ پہلا ادبی پرچہ تھا جو اپنے لکھنے والوں کو معاوضہ بھی ادا کرتا تھا اور یہ کہ زیرنظر اشاریہ کے آخر میں خود اشاریہ کا اشاریہ ہے اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد ہے، یہ دونوں دعوے محل نظر ہیں۔

ایمان کیا ہے؟: از شیخ عبدالمجید زندانی، مترجم جناب محمد سمعان خلیفہ بھٹکلی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۲۶، قیمت ۹۰ روپے، پتہ: مکتبہ الشباب (الجدیدہ) شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ نمبر - ۲۰۔

یمن کے شیخ عبدالمجید زندانی کے بارے میں کہا گیا کہ وہ عہد حاضر کے ایک داعی، عالم اور سائنس داں ہیں، دعوت و تبلیغ کی راہ میں ان کی جاں فشانی اور قربانی کا ذکر بھی ہوتا ہے، ان کی عربی کتاب ''الایمان'' کو ان کی اور کتابوں کی طرح مقبولیت حاصل ہوئی، انہوں نے ایمان کی حقیقت اور توحید و رسالت اور عبادات و اعمال سے اس کے تعلق پر عہد حاضر کے ذہن کو سامنے رکھ کر واقعی دل نشیں بحث کی ہے، ایمانی تقاضوں اور ایمان کے منافی چیزوں میں یہ رنگ اور نکھر کر سامنے آیا ہے، موجودہ مسلمانوں کی روش پر ان کی چند تحریریں خطرناک جہالتیں اور تنزل و پس ماندگی کے عنوان سے ہیں اور اس کے بعد ہی ایک تحریر کامیابی کا واحد راستہ کے عنوان سے ہے جس میں بڑے درد کے ساتھ کہا گیا کہ جو چیزیں مسلمانوں کی دینی نشاۃ ثانیہ کا سبب بن سکتی ہیں، ان کا ظہور اسی وقت ہوگا جب ایمان دل میں راسخ ہوگا، کتاب پر اثر ہے، اس کے مترجم ایک ہونہار نوجوان ہیں، اردو ان کی مادری زبان نہیں لیکن سلاست اور روانی کہیں کم نہیں، اس کے لئے وہ خاص طور پر ستائش کے لائق ہیں۔

فرات کے پاس: از جناب علی مختار مختار مبارک پوری، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۶۴، ہدیہ: حضرات محمدؐ و آل محمدؐ پر درود، پتہ: علی مختار اینڈ سنز، سلک مرچنٹ، پرانی بستی، مبارک پور، اعظم گڈھ۔

قریب تین سو شعری کاوشوں کے اس مجموعہ کے متعلق سرورق پر تحریر ہے کہ یہ غم انگیز نوحے،

سلام، مرثیے اور مثنوی پر مشتمل ہیں لیکن زیادہ حصہ نوحوں کا ہے جو رثائی شاعری میں مرثیوں سے بعض اوصاف کی بنا پر جدا ہیں، جیسے منظر نگاری سے زیادہ غم و اندوہ کے جذبات اس میں نمایاں کیے جاتے ہیں، پھر یہ نوحے افراد کربلا کی بے بسی اور آہ و زاری کے بیان تک محدود نہیں، دوسرے اہل بیت کی رحلت و شہادت پر بھی دردانگیز جذبات کا اظہار ہے، ہزاروں اشعار کا یہ مجموعہ شاعر کے احساسات الم ہی کا نہیں، ان کی پرگوئی اور کہنہ مشقی کا بھی ثبوت ہے، بچپن سے ان کو شاعری کا شوق رہا، مبارک پور میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کا ماحول اچھا خاصا تھا، وہاں کی بعض انجمنیں اپنی نوحہ و سلام خوانی کے لئے مشہور ہیں، خاندانی ماحول نے بھی شاعر کی فکر کو بال و پر عطا کیے اور اس کا نتیجہ پیش نظر مجموعہ کلام کی شکل میں ہے، مولانا قمرالزماں مبارک پوری نے تفصیل سے ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے، ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ'' ان نوحوں میں عشق اہل بیت اور خاندان نبوتؐ سے عقیدت کی ایسی تڑپ پائی جاتی ہے جو بغیر قلبی تعلق کے پیدا نہیں ہوسکتی''، اس کے علاوہ ان نوحوں میں تصنع اور تکلف پسندی سے شعوری احتراز ملتا ہے، جس سے اثر میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

چہرہ چہرہ روشن: مرتب ڈاکٹر راہی فدائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۱۲، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، علی گڑھ، ممبئی۔

ٹامل ناڈو کے جناب علیم صبا نویدی کی ہمہ جہت ادبی شخصیت سے شاید ہی اردو کا کوئی طالب علم اب ناواقف ہو، تحقیق، سخن گوئی اور افسانہ نگاری میں انہوں نے اپنی تحریروں بلکہ کتابوں کا انبار لگادیا ہے، جنوب ہند کی تامل زمین پر انہوں نے اردو کے چمن کو جس طرح روش در روش آراستہ کیا ہے اس کا اعتراف ہر حق شناس کو ہے، زیرنظر کتاب میں ان کے چند ایسے تبصرے ہیں جو خاص آندھرا پردیش کے مصنفوں اور ان کی کتابوں پر کیے گئے ہیں، راج بہادر گوڑ سے فہیم احمد تک قریب اٹھائیس اہل قلم کی کتابوں پر یہ تبصرے دل چسپ اور تبصرہ نگار کے تنقیدی ذوق کا آئینہ ہیں، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے ایک شعری مجموعہ پر ایک جملہ اس طرح ہے کہ '' آپ کی غزل نکھرتی، بولتی، مچلتی، لہکتی، ڈولتی اور گنگناتی آگے بڑھ رہی ہے''، مجموعی طور پر یہ مجموعہ کتابوں کے شائقین کو پسند آئے گا، اس پیش کش کے لئے لائق مرتب شکریے کے مستحق ہیں، کتابت البتہ معیاری نہیں اور قیمت تو بہت زیادہ ہے۔

مسنون دعائیں: از جناب مولانا محمد شعیب کوٹی قاسمی، صفحات ۸۲، قیمت مفت، پتہ: انفنی ٹی کمپیوٹر ڈویژن، گراؤنڈ فلور: ۳، کامیٹ بلڈنگ، گرونانک روڈ، اپوزٹ باندرہ تالاب، باندرہ (ویسٹ) ممبئی۔

قرآن کریم اور مجموعہ احادیث سے ماخوذ دعاؤں کا یہ انتخاب، دعاؤں کے بے شمار مجموعوں میں ایک اور اضافہ ہے لیکن اس کی انفرادیت اس کے فاضل مرتب کے حسن انتخاب کے علاوہ ان کے سلیس ترجمہ اور ان کے حواشی و فوائد کی وجہ سے ہے، کتابت کی غلطیاں البتہ ہیں، اگلے اڈیشن میں ان کی تصحیح ضروری ہے۔

ترغیب الصلوۃ: از مولانا عبد الغفار مئوی، قیمت درج نہیں، پتہ: مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ، مرقاۃ العلوم، پوسٹ بکس نمبر-۱، مئو، یوپی۔

نماز کے فضائل و مسائل پر محدث شہیر مولانا حبیب الرحمان اعظمی کے استاذ کا جامع رسالہ، آسان زبان میں۔

جدید عربی ادب کی نمائندہ انجمنیں: از پروفیسر کبریا صدیقی، قیمت درج نہیں، پتہ: کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ، نمبر-۴۔

اس میں بیت الحکمۃ اور موشحات سے مہجر اور رمزیہ جیسے ادبی رجحانوں اور بعض جدید اصناف سخن کی نمائندہ تحریکوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

دیوبندی اور بریلوی اختلافات: از مولانا اخلاق حسین قاسمی، قیمت درج نہیں، پتہ: محمد عتیق صدیقی، ۱۵۳۴، گلی قاسم جان بلی ماران، دہلی، نمبر-۶۔

اس مختصر لیکن اہم رسالے میں ہندوستان کے دو بڑے طبقوں کے اختلاف کو صرف لفظی اور تعبیری بتایا گیا ہے کہ اصول میں کوئی وجہ نزاع نہیں، ملت کے اتحاد کی فکر اور دردمندی نے اسے خاصا پراثر بنا دیا ہے۔

معلم العربی: از مولانا محمد غیاث الاسلام رحمانی، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: میسکو عربک لینگویج ایجوکیشن فاؤنڈیشن، دار الشفا، حیدر آباد۔

نورانی قاعدہ کے طرز پر، آسان ناظرہ خوانی کے لئے ایک اور مفید تجربہ۔

ع-ص

تصانیف مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ (حصہ اول): اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات و اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے — قیمت: ۶۰/روپئے

۲۔ اسوۂ صحابہ (حصہ دوم): اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ — قیمت: ۸۰/روپئے

۳۔ اسوۂ صحابیاتؓ: اس میں صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ — قیمت: ۲۵/روپئے

۴۔ سیرت عمر بن عبد العزیز: اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ — قیمت: ۶۰/روپئے

۵۔ امام رازیؒ: امام فخر الدین رازیؒ کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ — قیمت: ۹۰/روپئے

۶۔ حکمائے اسلام (حصہ اول): اس میں یونانی فلسفہ کے مآخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ — قیمت: ۱۵۰/روپئے

۷۔ حکمائے اسلام (حصہ دوم): متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے — قیمت: ۴۰/روپئے

۸۔ شعر الہند (حصہ اول): قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ — قیمت: ۸۰/روپئے

۹۔ شعر الہند (حصہ دوم): اردو شاعری کی تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ — قیمت: ۷۵/روپئے

۱۰۔ تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ — قیمت: ۱۲۵/روپئے

۱۱۔ انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاپردازانہ ترجمہ — قیمت: ۵۵/روپئے

۱۲۔ مقالات عبد السلام: مولانا مرحوم کے ادبی و تنقیدی مضامین کا ترجمہ — قیمت: ۶۰/روپئے

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی — قیمت: